نظیریں

عمران عاکف خان

www.urduchannel.in

©جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب	:	نظیریں
مصنف وناشر	:	عمران عاکف خان
مصنف کا پتہ	:	259, Tapti Hostel, Jawaharlal Nehru University, New Delhi - 110067 Mobile: 9911657591 Email: imranakifkhan@gmail.com
سن اشاعت	:	2017
تعداد	:	500
صفحات	:	200
قیمت	:	230/-
زیراہتمام	:	اپلائڈ بکس، 1739/10 (ذیلی منزل)، نیوکوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-110002 فون نمبر:011-23266347

ISBN 978-93-83239-67-2

ملنے کا پتہ

- اردو بک ریویو، 1739/3 (ذیلی منزل)، نیوکوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-110002 Email:urdubookreview@gmail.com
- پیس انڈیا فاؤنڈیشن، پنجابی بستی، سبزی منڈی، نئی دہلی-110007

NAZEEREIN
By: Imran Akif Khan
Ist Edition: 2017 Pages: 200 Price: Rs. 230/-
Printed at: H. S. Offset Printers, New Delhi - 2

Job\Applied Books\Applied Books11.jpg not found.

✹

میرؔ، غالبؔ، داغؔ، ابن صفی کی زبان

'اردو' کے نام!

جس کی دھوم ساری دنیا میں ہے۔

www.urduchannel.in

فہرست مضامین

1	عرض تمنا	07
2	مرزا رسوا کی ناول نگاری	10
3	مولوی محمد اسماعیل میرٹھی...	17
4	عصر حاضر میں گئودان کی معنویت	25
5	نظم 'بچے کی دعا' اور بچوں کی نفسیات	31
6	کرشن چندر: فخر بھرت پور	34
7	عصمت چغتائی: اردو ادب کا تابندہ ستارہ	40
8	ش۔ بانو ادیب: عظیم افسانہ نگار	50
9	راجندر سنگھ بیدی: تھیم کا بادشاہ	55
10	رشید حسن خاں: جو آبرو تھے اردو کی	61
11	پروفیسر قمر رئیس: عمومیت سے خصوصیت تک	67
12	ابن صفی کہتے ہیں...(نظم)	78
13	جب سورج غروب ہوا...	80
14	ابن صفی کا مشن: امن وانصاف کا فروغ	84
15	ماں اور منور رانا	89

www.urduchannel.in

16	ابن صفی غالب ثانی...	95
17	صدف اقبال کے افسانوں میں عہد موجود کی کشاکش	101
18	مناجات بیوہ اور ہمارا معاشرہ	114
19	ابن صفی کے زندہ جاوید کردار...	120
20	راجپوتانہ/راجستھان میں اردو	158
21	ابن صفی کے ناول اور تصوف	165
22	دلت فکشن کی نمایندہ پیش کش: تخم خوں	173
23	حکایات سعدی کی ادبی اہمیت	190

☆☆☆

عرض تمنا

عالمی زبانوں کے مقابلے اردو زبان وادب کو ابتدا سے ہی یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ یہ لذت کام ودہن سے زیادہ جذبوں کی ترجمان رہی ہے۔ نیز اس کی یہ خوبی اور کمال بھی رہا ہے کہ اس نے ہر دور میں اپنی جانب مایاناز اور عظیم ہستیوں کو متوجہ کیا ہے۔ ان سے داد وصول کی ہے اور اپنے لیے تعریفیں لوٹیں ہیں۔ شعرا و نثر نگاروں کا تو ذکر ہی کیا اس کی کشش وقبولیت عام گلیاروں سے بالا خانوں اور ایوانوں تک پہنچی ہے اور اس کے بسمل وقتیل ہر رنگ ونسل، طبقہ وذات، سلسلہ ومنہاج کے افراد ہوئے ہیں۔ بعض جماعتوں نے اور انجمنوں نے تو اسے باقاعدہ بیٹیوں کی طرح پالا اور اس کی عصمت وحرمت کو اپنے ساتھ جوڑ لیا۔ اس پر آنے والی کسی بھی افتاد کو خود پر پڑنے والی مصیبت سمجھا اور اس کا دفاع ایسے ہی کیا جیسے خود کا تحفظ کرتے ہیں۔ اسے اپنی زبان بنایا۔ اپنا بیان بنایا۔ اپنا کلمہ بنایا۔ اپنی شناخت اپنی عبادت بنایا۔

اردو زبان وادب تہذیب کا وہ حسین مرقع ہے جس کے بغیر مہذب انسانیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح یہ زبان یا وسیلۂ اظہار سے زیادہ وہ لباس ہے جس کے زیب تن کرنے سے شرافت ونجابت میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور انسان اسے پہن کر خود کو مکرم

www.urduchannel.in

ومعظم سمجھتا ہے۔ اردو جس کا لباس فاخرہ بنی، جس کے سر کا تاج اور ماتھے کی بندیا بنی، وہ مشہور عالم ہو گیا اور اس کی عظمت ہمدوش ثریا ہو گئی۔

اسی حقیقت کو بھانپ کر اپنے وقت کی مایاناز ہستیوں نے خود کو اردو سے وابستہ کیا اور اپنے جوہر قابل وخداداد صلاحیتیں اردو کے نام کر دیں۔ انھوں نے اپنے قیمتی رات دن اردو کے نام وقف کیے نیز اسے بہتر سے بہتر، آسان سے آسان اور عام سے عام فہم بنانے کے ساتھ ساتھ اس کے فروغ کے امکانات کے در بھی وا کر دیے۔ جہاں مشکل پیش آئی، اس کے لیے لڑے بھی اور جیتے بھی۔ ایک نسل کے بعد دوسری نسل اور دوسری کے بعد تیسری تا ایں اردو زبان وادب دلوں میں جاگزیں ہوتی رہی رہے، سنور تیر ہی۔ اپنے محبین وبہی خواہوں کو مقام بھی عطا کرتی رہی۔ پھر اردو ان کے نام سے ہی عبارت ہو گئی۔

اردو سے وابستہ سماجوں نے پہلے تو زبان بہ زبان اور سینہ بہ سینہ اس کی حفاظت کی۔ دوسرے دور میں جب کاغذ کا چلن ہوا، انھوں نے پہلی ہی فرصت میں دستاویزی حیثیت سے ان خوشبوؤں کو وہاں محفوظ کر لیا۔ کتاب، میگزین، جریدہ، رسالہ، اخبار، آثار، دفتر، دیوان، بیاض اس نئی رسم کو بہت سے نام دیے گئے۔ اس نئے دور میں آ کر اردو کو یک گونہ تحفظ حاصل ہوتا گیا اور وہ گھروں سے نکل کر اب بہ حفاظت بازاروں اور عام چوراہوں پر بھی آنے جانے لگی۔ اب کتابی دستاویز کی صورت میں ہر کس وناکس اس سے روشناس ہونے لگا۔

اردو کا یہ سفر خاصا طویل اور دقت طلب رہا ہے۔ اس سفر میں اسے متعدد بار نامناسب حالات سے دوچار ہونا پڑا، نئے لوگوں اور نئی زمینوں سے واسطہ ہوا تو کہیں اسے دشمن اور معاند افراد سے تنگی محسوس ہوئی۔ اسے اپنا مقام بنانے کے لیے ان تمام مراحل سے گزرنا پڑا

جس کا تصور وامکان روزمرہ کی زندگی میں ہم آئے دن کرتے ہیں۔

'نظیریں' ان نابغۂ روزگار اور مشاہیر اردو ادب ہستیوں کے تذکروں اور دیگر مضامین پر مشتمل میری پہلی پیش کش ہے۔ جنھوں نے برسوں چمن اردو کی آبیاری کی اور اس کے لیے زمانے بھر کی مصیبتوں کا سامنا کیا۔ آج اردو کو ان پر ناز ہے اور وہ ان کے قیمتی سرمایوں سے مالا مال ہے یہ تذکرے اور مضامین وہ نظیریں ہیں جو اردو زبان اور ادب سے متعلق کہی جانے والی باتوں کی صاف شہادتیں ہیں جن کے ذکر سے اردو کے متعلق بلند ہونے والی بے سُری آوازیں دب جاتی ہیں۔ اسی طرح اردو کے متعلق غیر مناسب بات کہنے والوں کے دعوؤں کو غلط ثابت کرنے کے لیے یہ مضامین اور ان کا مطالعہ بے نظیر 'نظیریں' ہیں۔

'نظیریں' دستاویز میں شامل وہ مضامین ہیں جو میں نے دوران درس/مطالعہ تحریر کیے اور ملک و بیرون ملک کے متعدد جرائد نے انھیں اہتمام شائع کیا ہے۔ بلکہ سنجیدہ قارئین نے ان پر اپنی قیمتی آرا سے بھی نوازا۔

'نظیریں' اردو دنیا کو دی جانے والی وہ سوغات ہے جس میں اردو سے اردو تک کی ہی باتیں ہیں۔ اردو کی ہی نکہت ہے اور اردو کی ہی بادِ نسیم ہے۔ جو حسب توقع سنجیدہ فکر و مطالعہ اور نظر کے حامل اردو قارئین کے دلوں پر دستک دے گی اور ان سے خراج تحسین وصول کرے گی۔

اس کے بعد بھی یہ احساس یقینی طور پر ہے کہ 'نظیریں' جیسی پیش کش اور کوشش کہاں تک کامیاب ہے؟ نیز اسے اردو روایت و رسم میں کہاں جگہ ملے گی؟ یہ فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے۔

✸ ✸ ✸

www.urduchannel.in

مرزا رسوا کی ناول نگاری

امراؤ جان ادآ کے حوالے سے

مرزا محمد ہادی رسوا کا نام سنتے اور پڑھتے ہی اردو ناول نگاری کی تاریخ کا وہ زریں عہد یاد آجاتا ہے جس میں اردو ادب کی یہ صنف مکمل جوان ہوگئی تھی اور اس کے چاہنے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا تھا۔ یہی وہ عہد تھا جب ناول نگاری، اپنی تکنیک، پلاٹ، انداز بیان، دل چسپ و صاف ستھرے مکالموں اور دلکش اسلوب، لب و لہجے کے باعث نصف النہار پر تھی۔ ایسا نہیں ہے کہ مرزا رسوا سے قبل ناول نہیں لکھے گئے یا موجود نہیں تھے، ضرور لکھے گئے اور موجود تھے مگر مرزا رسوا نے اپنی حیرت انگیز صلاحیتوں کے بل پر اس فن کو بام عروج تک پہنچا دیا۔

مرزا ہادی رسوا نے اپنے مشہور اور شہرہ آفاق ناول ''امراؤ جان اَدا'' سمیت تقریباً پانچ ناول لکھے جن کی تفصیل اس طرح ہے: افشائے راز (1896) امراؤ جان اَدا (1899) ذات شریف (جنوری 1900) شریف زادہ (دسمبر 1900) اختری بیگم (1924) ان ناولوں کے علاوہ مرزا نے دیگر اصناف ادب میں بھی خامہ فرسائی کی۔ جاسوسی ادب کی شکل

میں انھوں نے انگریزی ادب سے ترجمہ کر کے متعدد تخلیقات اردو دنیا کو پیش کیں جن میں خونی شہزادہ، بہرام کی رہائی، طلسمات، خونی جورو، خونی بھید اور خونی عاشق ـــــ شامل ہیں۔

مذکورہ بالا تمام تخلیقات مرزا رسوا کی قلمی و علمی عظمت کے بین ثبوت اور گواہ ہیں، ان میں مرزا نے زندگی کی تلخیوں، فلسفوں، اسرار خودی، انسان کی ازلی ضروریات، احساسات اور ٹریجڈیوں کا ذکر کھلے لفظوں میں کیا ہے۔ ان کا ہر ناول کرب انگیز حقائق سے بھرا اور سماج و وقت کی تلخیوں کا عنوان ہے۔

زیر نظر مضمون میں مرزا رسوا کے شاہ کار ناول 'امرؤ جان آدا' کو موضوع بحث بنا گیا ہے۔

مرزا رسوا نے 1899 میں اردو دنیا اور اردو ادب کے باذوق قارئین کو ''امراؤ جان آدا'' جیسا شاہ کار ناول عطا کیا جس کی آج تک دھوم ہے۔ یہ ناول مرزا رسوا کی ایک عظیم اور نایاب یادگار کے طور پر دلوں اور گھروں میں محفوظ ہے اردو ادب کے ناقدین نے اسے ادب العالیہ میں شمار کرتے ہوئے اسے رسوا کی تخلیقات کا سربراہ کہا ہے۔ ڈاکٹر سنبل نگار ''اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ'' میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''کوئی کتاب اگر اپنے وجود میں آنے کے بعد پچاس سال بعد بھی دل چسپی سے پڑھی جائے تو اسے ادب عالیہ میں شمار کیا جانا چاہیے، امراؤ جان ادا تقریباً ایک صدی پہلے لکھی گئی تھی۔ اس سو سالہ زندگی میں کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا جب اس کی مقبولیت کو گہن لگا ہو۔ فن کے پارکھوں نے ہر دور میں اسے خراج تحسین پیش کیا اور اعتراف کیا کہ یہ اردو کا پہلا ناول ہے جو فن کی کڑی سے کڑی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ یہی اس کے بقائے دوام کا راز ہے۔''

ڈاکٹر سنبل نگار کی اس بات سے ہر وہ شخص اتفاق کرے گا جس نے ''امراؤ جان آدا'' کا مطالعہ کیا ہے اور مرزا و امراؤ جان کے مکالموں، واقعات و حادثات کو سمجھا ہے۔ یقیناً یہ شاہ

www.urduchannel.in

کار ناول آج بھی مقبول عام ہے اور 116 سال کی مدت طویل کے بعد بھی اس کے چڑھتے سورج کو گہن نہیں لگا۔

امراؤ جان آدا ہمارے اردو ادب کا وہ سرمایۂ عظیم ہے جس کی نظیر کسی اور جگہ نہیں ملتی۔ جتنی مقبولیت اس ناول کو حاصل ہوئی اور جس قدر کو اس کو پڑھا گیا یا، اس کے اثرات قبول کیے گئے، ایسا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ مرزا رسوا نے اس شاہ کار ناول میں طوائف کے آئینہ خانے میں لکھنوی تہذیب و تمدن اور 19 ویں صدی میں برصغیر کے سماجی اور قومی زوال کے نقوش اس طرح بیان کیے ہیں کہ ایک پورا عہد ہماری نظروں کے سامنے چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ''امراؤ جان آدا، تنقید و تبصرہ'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ کہانی ایک طوائف کی داستان نہیں ایک تہذیب اور معاشرے کی کہانی ہے۔ 19 ویں صدی کے آخر اور 20 ویں صدی کے آغاز کے معاشرے کی جو اپنی تمام خرابیوں، خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہمیں عزیز ہے۔''

مرزا رسوا نے اپنی تمام تخلیقات کے سربراہ ناول ''امراؤ جان آدا'' میں حقیقتاً قلم توڑ کر رکھ دیا۔ لکھنؤ کی ایک شریف اور نستعلیق طوائف امراؤ جان آدا کی زندگی کے نشیب و فراز، اس کا امیرن سے امراؤ بننا۔ اپنوں سے بچھڑنے کا غم۔ دل کا بار بار بھر آنا، پھر دل کو سمجھا کر رنڈیوں کے ماحول میں خود کو بسانا۔ اس کے بعد جب جوبن پر نکھار آیا اور دل میں دبی امنگوں اور چاہتوں نے جوش مارا اس وقت کی ادا کی کیفیت اور اسی گوہر مرزا کا اسے اچھا لگنا جسے وہ ہر روز مولوی صاحب سے پٹواتی تھی، اس کے ساتھ گانا گانا، اس کی لے میں لے، سُر میں سُر اور تال سے تال ملانا۔ تمام ساتھی رنڈیوں کی دیکھا دیکھی دولت کی

ہوس، دوسروں کی طرح انداز و ادا اور ناز اختیار کرنے کی آرزو... یہاں تک پہنچنے کے بعد لڑکھڑا کر پھر سنبھلنا اور خود کو جذبات کی رَو میں بہنے سے بچانا..... یہ کرب نا کی، یہ ٹریجڈی، یہ رنج، یہ محرومیاں، یہ حسرتیں اس ناول کے حرف حرف اور لفظ لفظ سے جھلکتی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں لکھنوی تہذیب وتمدن اور معاشرت کا بیان، اس وقت کا لکھنؤ، شہر نگاران لکھنؤ، نوابوں اور بڑے لوگوں کا لکھنؤ، پوری طرح موجود ہے۔ عالم یہ ہے کہ جن لوگوں نے غدر سے پہلے کا لکھنؤ نہیں دیکھا اور دیکھنے کی آرزو رکھتے ہیں، وہ اس ناول کو پڑھ کر ماضی کا حصہ بنے اس لکھنؤ کا نظارا کر سکتے ہیں۔

اردو دنیا کو بلا تامل وتردد اس بات کا اعتراف ہے کہ مرزا رسوا وہ واحد فن کار ہیں جنھوں نے سب سے پہلے ناول نگاری میں البیلا اور انوکھا انداز اختیار کیا اور خود مرکزی کردار ''امراؤ جان اداؔ'' سے اس کے، اس کے ہم جلیسوں، دوستوں، اس کے چاہنے والوں اور اس کے خوگروں کے احوال پوچھ پوچھ کر لکھے۔ ان کے پیش روؤں: ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر وغیرہ کے ناولوں میں یہ تکنیک نہیں ہے۔ نیز پس روؤں کے یہاں بھی اس کی مثال ناپید ہے۔

محمد اقبال ایم اے، اپنے مضمون ''مرزا رسوا۔ حیات اور فن'' میں لکھتے ہیں:

''امراؤ جان اداؔ، اردو کا پہلا ناول ہے جس میں ایک کردار کی زبان سے واقعات کے بیان کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس سے پہلے نذیر احمد، سرشار اور شرر کے ناولوں کا پلاٹ حالانکہ اس طرز پر ہے مگر انھوں نے اکثر بیان کنندہ کا پردہ ہٹا کر خود واقعات پر تبصرہ کرنا شروع کر دیا جس سے وہ پلاٹ فنا ہو گیا، رسوؔا نے اس ناول میں اپنے کردار کو ناول کا جز بنا دیا ہے وہ اس طرح کہ امراؤ جان اداؔ تمام واقعات رسوؔا کو سناتی جاتی ہے اور رسوؔا ان پر قدرتاً تنقید وتبصرہ کرتا جاتا ہے۔''

www.urduchannel.in

اگر سرسری طور پر دیکھا جائے تو 'امراؤ جان اداؔ' طوائف کا ایک معمولی سا قصہ ہے لیکن جذباتی ترجمانی، ڈرمائی پیش کش، نفسیاتی انداز اور دل چسپ اسلوب بیان نے اس کی عظمت میں چار چاند لگا دیے اور اسے اردو زبان کا ایک عظیم الشان ناول بنا دیا۔

ناول کی اسی خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے قاضی عبیدالرحمان ہاشمی لکھتے ہیں:

''رسوا نے فلسفیانہ فکر، نفسیاتی تجزیہ، ادبی اور شاعرانہ ذوق اور فنی حسن ترتیب سے اس ناول میں اس طرح کام لیا ہے کہ خود ناول کا فن گہرائی، لطافت، نزاکت وہمہ گیریوں کی بلندیوں تک پہنچ گیا.....''

اس ناول کا پلاٹ بہت ہی شاندار ہے جس نے اسے ایک مکمل اور یادگار ناول بنا دیا ہے۔ تمام کہانی خود امراؤ جان ادا کی زبانی بیان ہوئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے اور معمولی جملے۔ بات سے بات نکلتی جاتی ہے۔ رابطے سے رابطہ ملتا ہے۔ کڑی سے کڑی مل کر سلسلہ بنتا جاتا ہے۔ رنگ پہ رنگ چڑھتا ہے۔ درمیان میں برجستہ، برمحل و بامعانی اشعار۔ کردار بھی آتے جاتے ہیں۔ زندگی سبک رفتاری سے رواں دواں ہے۔ کہیں ہنگامہ خیزی اور کہیں ناگفتہ بہہ حالات سے گزرتی جاتی ہے۔ تقریباً اس میں وہی تمام عوامل ومحرکات درآتے ہیں جو ایک بھرپور، توانا اور شاندار زندگی میں ہوتے ہیں۔ رنج بھی ہے، خوشی بھی ہے۔ اپنوں سے بچھڑنے کا رنج وکبیدہ خاطری بھی ہے اور نئے لوگوں سے مل کر غم بھول جانا بھی۔ دردر بھٹکنا بھی ہے اور حصول دولت وروزی کمائی کے لیے یہاں سے وہاں جانا بھی۔ عصمت ووعفت کے تارتار ہونے کا اندیشہ بھی ہے۔ بھوک بھی ہے اور سیری بھی۔ رنگین راتیں بھی ہیں اور سیاہ دن بھی۔ ان تمام خصوصیات کی بدولت مذکورہ ناول ایک ایسی عمارت معلوم ہوتا ہے جسے اینٹ سے اینٹ اور پتھر سے پتھر جوڑ کر بنایا گیا ہو۔ کہیں بھی اس میں رخنہ، کجی، خلا اور انقطاع رابطہ کا سقم نہیں ہے۔

''امراؤ جان آدا'' کا قصہ صرف اتنا ہے کہ جس وقت لکھنؤ کی قسمت کا تاج بلندیوں پر تھا۔ پورا شہر ناز و نعم میں جی رہا تھا اور ہر شخص مال و دولت کے بل پر اپنا جہان بسا کر نواب، خان بہادر، سلطان، شاہ، حضور، بنا ہوا تھا۔ جہاں اس کی ضروریات زندگی میں کھانا پینا، لباس و پوشاک اور گھر بار تھا وہیں طوائفوں کے کوٹھوں پر جانا، اہم تقریبات کے موقع پر ان کے مجرے کرانا، ان سے دل بہلانا یا انھیں اپنے گھر میں رکھنا بھی ضروریات زندگی میں شامل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت لکھنؤ میں طوائفوں کے بے شمار کوٹھے تھے اور ان کی آبادی کے لیے نو عمر لڑکیوں کی خرید و فروخت کا سلسلہ زوروں پر تھا.... ایسے ہی حالات میں لکھنؤ سے بہت دور فیض آباد سے ایک لڑکی اغوا کر کے لائی جاتی ہے، کچھ غنڈے موالی قسم کے لوگ جن کے نام مرزا رسوا نے امراؤ جان آدا کی زبانی ''پیر بخش'' اور ''دلاور خان'' بتائے گئے ہیں اس بدکاری کو انجام دیتے ہیں اور بازار مصر میں یوسف کی فروخت کے طرز پر اسے لکھنؤ کے ''کوٹھا بازار'' میں بیچ دیتے ہیں۔ جہاں اس پر ابتدائی دن انتہائی سخت اور جان سوز ثابت ہوتے ہیں ...اس سمئے '' وقت'' اس کی زخمی زخمی آنکھوں اور اعصاب پر خوبصورت، رنگین، خوشبودار مرہم رکھ دیتا ہے اور وہ مکمل طوائف بن جاتی ہے۔ ''امراؤ جان آدا'' شعر بھی موزوں کرنے لگتی ہے، غزلیں بھی لکھتی ہے۔ اور اپنے مجروں میں ان کے ذریعے سامعین سے داد وصول کرتی ہے۔ زندگی اڑان بھرتی ہے غدر کا زمانہ آتا ہے، شہر اجڑتا ہے، محفلیں برباد ہوتی ہیں اور امراؤ جان ادا لکھنؤ، کانپور، فیض آباد ہوتے ہوئے پھر لکھنؤ پہنچ جاتی ہے، وہیں اسے ایک خوشگوار موقع فراہم ہوتا ہے اور اپنے اغوا کار، دلاور خان ڈاکو کو اس کے انجام تک پہنچوا دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ طوائف سے توبہ کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لیتی ہے اور قصہ تمام ہو جاتا ہے۔

www.urduchannel.in

یہاں آ کر قاری کتاب بند کر دیتا ہے مگر اس قصے کا اثر اس پر چھا جاتا ہے۔ ایک سحر سا اسے جکڑ لیتا ہے۔ ناول کے کردار، پلاٹ، تکنیک، انداز بیان و اسلوب نگارش اور شستہ و دلکش زبان اس کے ذہن و دماغ میں بس جاتی ہے۔ یہی ہے مرزا رسوا کا فن اور ان کی ناول نگاری کا کمال۔

ناقدین اردو ادب کہتے ہیں کہ مرزا رسوا اگر اس ناول کے علاوہ کچھ اور نہ لکھتے تب بھی اردو ادب میں ان کی عظمت و بلندی اسی طرح رہتی۔ یقیناً امراؤ جان آدا ایسا ہی ناول ہے جس نے مرزا محمد ہادی رسوا کو ابدی حیات بخش دی۔

مآخذو مراجع

سنبل نگار۔ ڈاکٹر: اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ۔ علی گڑھ۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ 1999

صدیقی۔ ڈاکٹر ابواللیث: امراؤ جان آدا۔ تنقید و تبصرہ۔ نئی دہلی۔ اعجاز پبلشنگ ہاؤس۔ 1986

محمد اقبال ایم اے: مرزا رسوا حیات اور فن۔ نئی دہلی۔ اعجاز پبلشنگ ہاؤس۔ 1992

ہاشمی۔ قاضی عبید الرحمان: میراث ہنر۔ لکھنؤ۔ 1997

✸ ✸ ✸

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی

اردو زبان و ادب کے ایک عظیم محسن

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی (12 نومبر 1844--- یکم/نومبر 1917) اردو ادب کے ایک زریں عہد کا نام ہے۔ ایک تابندہ اور زریں دور کا نام ہے۔ اس وقت تک باقی رہنے والا نام، جب تک اردو ادب اور اردو ادب کے طالب علم، اردو کے شیدائی وشائقین باقی رہیں گے۔ اس کی وجہ ہے کہ یہ آپ نے اردو زبان ادب کی تعمیر وترقی کے سلسلے میں آج سے سو سال قبل جو کارنامے انجام دیے وہ آج بھی اسی آب وتاب کے ساتھ باقی وموجود ہیں بلکہ پرانی نسلوں کے بعد نئی نسلیں ان سے فیض یاب ہو رہی ہیں۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی زندگی بھر اردو ادب کی آبیاری اور ان تھک کوششوں کو دیکھ کر اگر انھیں اردو کا عظیم محسن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ سچائی اور حقیقت بھی ہے کہ ان کے ذریعے تیار کردہ نصاب اردو 'اردو زبان کا قاعدہ سے لے کر اردو زبان کی پانچویں کتاب' تک ایسا تدریسی اور تربیتی نصاب ہے جس سے ہر اردو شائق اور اردو قاری کو واسطہ پڑا ہے۔ نونہالوں کے لیے تو اس سے مفید نصاب کوئی اور ہے ہی نہیں۔ یہ بات

www.urduchannel.in

اب ڈھکی چھپی نہ رہی کہ اسی نصاب کو پڑھ کر اور اسی سے ہی سیکھ سیکھ کر قلم کار تحقیقی، تنقیدی، سائنسی، سماجی، ادبی، سیاسی، معاشی تدریسی غرض ہمہ اقسام کے مضامین لکھنے کے قابل بنے۔ شعرا نے وہیں سے ہی بچوں کی نظمیں، بڑوں کی نظمیں، دوہے، قطعے، بیت، سبق آموز مثنویاں اور پر کیف نظمیں لکھنے کا طریقہ سیکھا۔ کہانی کاروں، افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں نے اسی نصاب کو پڑھا اور ایک سے بڑھ کر کہانیاں، افسانے و ناول لکھے۔ صحافیوں اور نامہ نگاروں نے وہیں سے واقعہ نگاری اور صورت حال پر خامہ فرسائی کا اسلوب سیکھا کیا۔ استاذوں نے وہیں سے ہی بچوں کو سبق پڑھانے اور اردو سے آشنائی کرانے کا گُر جانا۔ معلّمین کو وہیں سے ہی تعلیم وتربیت کا ڈھنگ ملا۔ ماں باپ کو اپنے بچوں کو اچھے برے کی تمیز سکھانے اور انھیں بہترین زندگانی گزارنے کا سبق اسی نصاب سے ملا۔ دادیوں اور نانیوں نے ان ہی کتابوں کو پڑھ کر بچوں کو کہانیاں سنائیں----- اور تو اور کسانوں، کھیتی باڑی کرنے والوں اور ہل جوتنے والوں تک کے لیے اس نصاب میں کسانی، آب پاشی واچھی پیداوار کرنے کے طریقے اور نسخے ٹوٹکے موجود ہیں۔ عالم یہ ہے کہ ایک مقام پر پروفیسر گوپی چند نارنگ ان کتابوں اور اس نصاب کی افادیت واہمیت کے متعلق اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''.....صوبہ جات متحدہ آگرہ واودھ میں اسماعیل میرٹھی نے اردو کا پہلا قاعدہ اور پہلے سے پانچویں درجے تک کی کتابیں تصنیف کیں۔ تب سے اب تک ان کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا یہ عالم ہے کہ لاکھوں، کروڑوں نوخیز ذہنوں کی آب یاری میں ان کتابوں سے مدد ملی ہوگی۔''

پروفیسر نارنگ کا یہ قول مبنی بر حقیقت ہے اور اس میں کوئی دورائے نہیں ہے۔ ان کتابوں کی مقبولیت کا عالم صرف یہی نہیں ہے کہ ان کی باتیں ہر ذہن میں اُتر جاتی ہیں بلکہ

یہ بھی ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک یعنی ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے تک ان کے کروڑ ہا ایڈیشن چھپ چکے ہیں جن کا سلسلہ بغیر رُکیا آج تک جاری ہے۔اس کے علاوہ اگر اردو پڑھنے لکھنے والوں اور اردو سے شغف رکھنے والوں کا ایک عمومی سروے کیا جائے اور ان سے معلوم کیا جائے کہ انھوں نے ابتدائی اردو کہاں سے سیکھی تو کثیر تعداد اُن حضرات کی ہوگی جنھوں نے زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں اس نصاب سے ضرور استفادہ کیا ہے۔

مولوی صاحب کے اس نصاب کے متعلق بابائے اردو مولوی عبدالحق کے الفاظ ہیں:

''(یہ) ایک کام اُن کا ایسا ہے جو اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ اُن کی وہ نظمیں ہیں جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھی ہیں۔ ہماری زبان میں ان کی نظیر نہ تو پہلے تھی اور نہ ان کے بعد اب تک لکھی گئیں۔''

معروف نقاد اور محقق پروفیسر احتشام حسین نے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کو 'سعدیٔ ہند' اور 'بچوں کے اسماعیل' کہہ کر ان کے کارناموں کا اعتراف اس طرح کیا ہے:

''تعلیمی نقطۂ نظر سے باضابطہ معیاری کوشش مولوی محمد اسماعیل کا حصہ تھا۔ 'سعدیٔ ہند' اور 'بچوں کے اسماعیل' دونوں لقب ان کے لیے مناسب تھے۔''

ڈاکٹر سیفی پریمی اپنی کتاب 'اسماعیل میرٹھی حیات و خدمات' میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کا مقام اردو کے بنیاد گزاروں اور عظیم محسنوں میں ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کسی قوم کی بقا و ضمانت اور مستقبل کی امید اس قوم کے نونہال تصور کیے جاتے۔ اس لحاظ سے ''بچوں کا ادب'' بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ''اساسی ادب'' نہایت قابل توجہ ہے اور اس مقام پر ہمیں حالی، شبلی، نذیر احمد، مولانا حسین آزاد اور مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کا نام بھی لینا چاہیے۔''

ڈاکٹر سیفی پریمی آگے لکھتے ہیں:

www.urduchannel.in

''مولوی محمد اسماعیل کے ریڈروں میں ابتدائی اور ثانوی منزل کے طلبا کی استعداد، ذہن، نفسیات اور فرہنگ کا لحاظ رکھتے ہوئے جو کچھ بھی شامل کیا گیا ہے، وہ نہایت ہی غور و خوض اور سوچ بچار کے بعد کیا گیا ہے۔ بچوں کے لیے اسماعیل نے جو نظمیں کہی ہیں وہ مفید ہونے کے علاوہ لطف و انبساط کی کیفیت بھی رکھتی ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ تاریخ اردو ادب میں ناقابل فراموش اور یادگار رہے گا۔''

اسی طرح کِسریٰ منہاس لکھتی ہیں:

''برصغیر میں اردو کی بہترین کتابیں وہ ہیں جو اسماعیل میرٹھی نے بچوں کے لیے مرتب کیں۔ اسماعیل میرٹھی نے اتنا ہی نہیں کیا کہ موزوں انتخابات بچوں کی عمر کے لحاظ سے مرتب کر دیے بلکہ انھوں نے محسوس کیا کہ اردو زبان میں سب سے زیادہ کمی یہ ہے کہ مختلف عمر کے بچوں کے لیے موزوں نظمیں موجود نہیں ہیں۔ اس کمی کو انھوں نے ہی پورا کیا۔''

مولوی محمد اسماعیل کی نظم نگاری، اردو ادب میں ان کا مقام اور بچوں کے لیے ان کی اہمیت و افادیت کے متعلق ڈاکٹر خوشحال زیدی کا خیال ہے:

''ان کی تمام نظموں میں سادگی صفائی اور اخلاق ہے جو کہ بچوں کو اعلا درس دیتی ہیں لیکن یہ نظمیں صرف بچوں کے لیے ہی اہم نہیں ہیں بلکہ ان میں جوان، بوڑھے سب کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا ہے۔''

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی فطرت اور حقیقت سے قریب و مختصر نظم نگاری کا عالم تو یہ ہے کہ بچپن میں جنھوں نے پڑھیں وہ نظمیں، انگلش پوئمس کی مانند آج بھی یاد ہیں اور دوران گفتگو ان کا برمحل استعمال خوب ہی رنگ جماتا ہے۔ 'خدا کی تعریف'، 'اسلم کی بلّی'، 'ایک گدھا شیر بنا تھا'، 'ہماری گائے'، 'جگنو اور بچہ'، 'نیک دل لڑکا'، 'بارش کا پہلا قطرہ'، 'ایک وقت میں ایک کام'، 'پن چکی'، 'کھلاڑی اور پھسڈی'، 'ہوا چلی'، 'ساون کی جھڑی'، 'ملمع کی انگوٹھی'، 'کچھوا اور خرگوش'، غرض مولوی صاحب نے بچوں کے لیے مشاہداتی، صفاتی، تمثیلی، ہیئتی ہمہ اقسام

کی نظمیں لکھیں، جن کا ہر کوئی معترف ہے اور ہر کوئی ان کا مداح ہے۔اس کے علاوہ یہ نظمیں اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ بھی ہیں۔

مولوی صاحب کی ان نظموں نے ہمارے عظیم شعرا کو بھی متاثر کیا اور ان کے دل میں جگہ بنائی۔بعض قدر دانوں نے تو ان کو نئے اسلوب و آہنگ میں ڈھال کر بلندیوں تک پہنچا دیا۔میری اس بات کی تائید کے لیے اردو شاعری کی آبرو اور معتبر مقام کی مالک پروین شاکر کا یہ اعتراف کافی ہے جو انھوں نے ریڈیو پاکستان کو انٹرویو دیتے ہوئے کیا تھا۔ان سے آر جے نے پوچھا تھا:

آر جے: پروین شاکر صاحبہ! آپ کا یہ شعر پڑھ کر----

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں

بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

ایسا لگتا ہے کہ آپ نے یہ شعر مولوی اسماعیل میرٹھی کی نظم 'جگنو اور بچہ' پڑھ کر موزوں کیا ہے؟

پروین شاکر: جی ہاں یہ حقیقت ہے۔اس لیے کہ اس نظم میں یہ دکھایا گیا ہے ایک بچہ جگنو کو رات میں پکڑ کر اپنی ٹوپی میں رکھ لیتا ہے اور جب صبح ہوتی ہے تو اس سے چمکنے کے لیے کہتا ہے اور یہ کہنا ضد کرنے کی مانند ہے۔مگر آپ جانتے ہیں کہ جگنو دن کے وقت ہرگز نہیں چمک سکتا۔مگر بچے کی ضد کچھ نہ کچھ تو ضرور کہتی ہے اور اس کی چالاکی و ہوشیاری کو اجاگر کرتی ہے۔جہاں سے میں نے کہا---

بچے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے۔''

عظیم شاعرہ پروین شاکر کا یہ اعتراف مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کو دیا جانے والا ایک لازوال خراج عقیدت اور ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ہے۔اسے پروین کی دیانت داری ہی کہا جائے گا کہ انھوں نے اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا ورنہ اردو زبان کا ہر شاعر،

www.urduchannel.in

ہر ادیب اور ہر دانش ور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کے بار تلے دبا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی کتابیں، نصاب، بچوں کا ادب، سب کچھ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔اس کے علمی اور زندہ شواہد دنیا کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے ہیں۔

واضح رہے کہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی نے یہ نصاب اس وقت تیار کیا تھا جب اردو میں سرسید تحریک کے زیر اثر سادہ و شستہ انداز کا چلن بس عام ہو رہا تھا اور اس میں پختگی ابھی نہیں آئی تھی، اس کے باوجود اسماعیل میرٹھی کے نصاب میں شامل مضامین، حکایات، تربیت کی باتوں اور سبق آموز جملوں و فقروں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہی نہیں کہ وہ اس دور کے ہیں۔اتنی آسان زبان، شگفتہ انداز، سہل اسلوب، روزمرہ کی باتیں جو نوخیز بچوں کے دلوں میں اترتی چلی جائیں۔ایسا لگتا ہے جیسے یہ آج کے حالات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مولوی محمد اسماعیل کی ان کتابوں نے جہاں نوخیز بچوں یا ان کو پڑھنے والوں کو زبان سکھائی ہے وہیں ان کو سائنس، جغرافیہ، تاریخ، معلومات عامہ سے بھی روشناس کرایا ہے۔انھیں اچھے برے کی تمیز سکھائی اور صحیح و غلط کے فرق کو سمجھایا۔اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جن بچوں یا افراد نے اس نصاب اور مولوی صاحب کی کتابوں کو پڑھا ہے ان کا ذہن کتنا سلجھا ہوا اور انسانیت و سماج، ملک و ملت، معاشرہ و سوسائٹی کے حق میں کتنا مفید ہوتا ہوگا۔مزید برآں اپنی ہر بات کو اپنے قارئین تک حق بہ حق پہچانے کی غرض سے مولوی صاحب نے ہر سبق کے آخر میں اہتمام سے مشکل الفاظ کی فہرست اور ان کو سمجھانے کے لیے آپ ہی نے ہی ایک کنجی بھی تیار کی۔جس سے کتاب اور اس کے مشمولات کا حسن دوبالا ہو گیا۔یہ ہے اسماعیل میرٹھی کا اردو نصاب۔جس نے دیکھتے ہی دیکھتے اردو دنیا میں ایک انقلاب سا برپا کر دیا جسے محسوس کرنے والوں نے محسوس کیا اور اس

سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کے ساتھ ہونے والی اس عالمی ناانصافی پر ایک بار پھر سے یہ بات کہی جائے گی کہ آج اردو ادب کی اس قدر خدمت اور اسے شجر سایہ دار بنانے میں اپنی جان سے لے کر سب کچھ قربان کر دینے والے مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کو بھولے سے بھی یاد نہیں کیا جاتا۔ نہ کبھی ان کے فن اور نقطۂ نگاہ کا منصفانہ جائزہ لیا گیا اور نہ ہی ان کی نظموں کو قابل اعتنا سمجھا گیا۔ نہ ان کی صدی منائی گئی اور نہ ان کے نام سے کوئی سالانہ یادگاری و دعائیہ جلسہ منعقد کیا گیا۔ نہ ان کے نام سے دانش گاہوں میں گوشے، سینٹرس، دروازے، ادارے اور چیئر ہیں اور نہ عوامی سطح پر ان کی عظمت وشان کا مظاہرہ کیا گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کے مضامین، نظموں، قطعوں، مثنیوں اور قصیدوں کا تنقیدی، تحقیقی اور ادبی جائزہ لیا جاتا اور ان کے مخفی پہلوؤں کو نئے دور کی روشنی سے ہم آہنگ کر کے مفید بنایا جاتا۔ اسی طرح مولوی اسماعیل کے فن اور شخصیت کو زندہ جاوید بنانے کی کوششیں ہوتیں۔ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ یہ تو ایک رہی، ان کا یوم پیدائش آتا ہے اور یوم وفات بھی مگر یہ دونوں دن بقیہ دنوں کی طرح چپ چاپ چلے جاتے ہیں۔ پتا نہیں اس کا ذمے دار کون ہے اور کس کے سر اس کا ٹھیکر پھوڑا جائے، مگر یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہم اردو والوں میں عمومی طور پر یہ خرابی پائی جاتی ہے کہ زمینی سطح پر کسی بڑے مشن، پیغام، سلسلہ، طریقہ، نہج، اسلوب اور انداز کو شروع کرنے والے لوگوں کو کلّی نہیں تو جزوی طور پر بھلا دیا جاتا ہے۔ ان کی جاں فشانی اور محنت و مشقت سے ایجاد کردہ راستے پر چل کر جب ہم منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں تو ہمیں اس بات کا بالکل بھی خیال نہیں رہتا کہ اس کے بانی کی شان میں، تعریف میں، یاد میں دو لفظ شکرانہ کے ہی ادا کر دیں بلکہ اسے نہ جانے کیوں وقت کا ضیاع اور بے عقلی و بے وقوفی سمجھا جاتا ہے۔ اس

www.urduchannel.in

حقیقت کو پروفیسر گوپی چند نارنگ کے الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے:

''ہم نے ماضی کے ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور مستقبل کے افق پر نظریں گاڑنے والوں کو تو بجا طور پر یاد رکھا، لیکن اُس شخص کو بھول گئے، جس نے زمین سے سیدھے سبھاؤ چلنا سکھایا اور حال صرف حال سے واسطہ رکھا۔''

افسوس ہوتا ہے کہ اتنے عظیم الشان اور علم وادب کے عظیم محسن، مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالی کی روایات کو آگے بڑھانے والی عظیم شخصیت کو اس طرح نظر انداز کر دیا گیا کہ گویا ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ بھلا ایسا ہوتا ہے کہیں اور کیا ایسا کرنا چاہیے؟ میرا یہ سوال پتا نہیں شرمندہ جواب ہوگا کہ نہیں تاہم ایک سلگتا ہوا شعلہ اور لمحۂ فکریہ بن کر ضرور حساس ذہنوں میں ہل چل مچائے گا۔ ایسے محسن اردو کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ انتہائی تکلیف دہ اور افسوس ناک امر ہے۔

مآخذو مراجع:

سیفی پریمی۔ ڈاکٹر۔ مقدمہ اسماعیل میرٹھی حیات و خدمات۔ نئی دہلی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اکتوبر 1976

مولوی عبدالحق۔ ڈاکٹر۔ سہ ماہی اردو۔ دہلی۔ انجمن ترقی اردو (ہند)۔ جنوری 1940

احتشام حسین۔ سید۔ اردو کی کہانی۔ لکھنؤ۔ ناشر سید انصار حسین۔ مئی 1962

سیفی پریمی۔ ڈاکٹر۔ اسماعیل میرٹھی حیات وخدمات۔ نئی دہلی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اکتوبر 1976

منہاس۔ کسریٰ۔ بچوں کا ادب اور اسماعیل میرٹھی۔ راولپنڈی۔ نیرنگ خیال (سالنامہ) 1976

خوشحال زیدی۔ ڈاکٹر۔ ادب نما جدید۔ نئی دہلی۔ ادارہ بزم خضر راہ، جامعہ نگر۔ 2000

پروگرم ریڈیو پاکستان۔ 'پروین شاکر سے ایک ملاقات' 15 جولائی 1980۔ بوقت 6: بجے۔ شام

✸ ✸ ✸

عصر حاضر میں گئودان کی معنویت

اردو زبان وادب کو اس بات پر بجا طور پر فخر حاصل ہے نیز ایک گونہ غرور بھی کہ اسے پریم چند جیسے عظیم فن کاروں نے اپنے احساسات، فن، قلم، وجدان، فکر اور آرزوؤں سے کا لہو پلا کر سجایا، اسے جوان کیا، اس کے سر پر آنچل ڈالا اور اسے وہ سب کچھ دیا جس کی اسے ضرورت تھی بلکہ اس پر مستزاد بھی۔ چنانچہ آج تک دیتے آرہے ہیں اور جیسے جیسے، جہاں جہاں اس کی آبرو اور اس کی عصمت بچانے، اس کی شان اور اس کا نام بلند کرنے کا وقت آتا ہے، وہ تن من دھن سے اس کے لیے تیار نظر آتے ہیں۔

اردو ادب کے ان بے لوث خادموں میں ایک نام 'منشی پریم چند' کا نام بھی ہے۔ جن کے قلم نے جس مضمون کو چھوا، وہ جاوداں بنتا گیا۔ مجروحؔ سلطان پوری کے مطابق:

دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں نہیں!
جس کو میں چھوتا گیا، وہ جاوداں بنتا گیا!!

پریم چند کے شاہ کار ناولوں کے لامتناہی سلسلوں میں ایک نام 'گئودان' کا بھی ہے۔ ناول 'گئودان' محض ایک نام ہی نہیں بلکہ ایسا ناول ہے جس کے لیے کسی آج کے 'علی عباس

www.urduchannel.in

حسینی' کو کہنا ہوگا کہ 'بلا شبہ وہ آفاق' کی بلندیوں پر جا کر چمکے گا اور قیامت تک اس کی روشنی و تابانی باقی رہے گی۔ اس لیے کہ 'گئودان' اپنے اندر بے شمار اور بے مثال خوبیاں رکھنے والا ناول ہے۔ اس جیسے شاہ کار ناول اردو دنیا میں بہت کم، بلکہ نایاب ہیں۔

'گئودان' اس سماجی نابرابری، بڑے لوگوں کے چھوٹوں اور مزدور طبقات والے افراد پر ظلم وزیادتی کی وہ کہانی ہے جسے انیسویں صدی میں ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گاؤں میں دہرایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سگے بھائیوں، خاندانوں کے کھاتے پیتے افراد کے درمیان چپقلش، حسد، جلن، اس کی بربادی کی کوششیں اور اس کے لیے گری سے گری حرکتیں کرنا، اپنے ہی سگے چھوٹے بڑے بھائیوں کے مابین یہ باتیں۔ یہ بھی تو، کہ اس وقت کی سیاست کیسی تھی، کس طرح سے ہندوستان کے سیٹھ، امیر، زمین دار، بنئے، قرض دینے والے، گاؤں کے عام طبقات کا طرز معاشرت، لین دین اور آپسی میل ملاپ کس قسم کا تھا۔ یہ ناول اس عہد کی ایک تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جس میں ہمیں یہ ساری چیزیں نظر آجاتی ہیں۔ چنانچہ جب ہم ان حالات کا آج کے حالات سے موازنہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے واقعی اس وقت مزدوروں اور غریبوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے یا خود وہ ہی اپنے اوپر ان مصیبتوں کو لادتے تھے۔ چنانچہ اگر انھیں اگر کوئی کہتا کہ 'ہمیں سیاست بازوں، سیٹھوں اور زمین داروں کی زیادہ جی حضوری نہیں کرنی چاہیے' جیسے ایک مقام پر 'گوبر' اپنے باپ 'ہوری' سے کہتا ہے:

''باپو یہ لوگ بہت چالاک ہیں۔ ہمیں بے وقوف بنا کر ہمارا مال لے کر ہمیں برباد کرتے ہیں، ان کی چالوں کو ہمیں سمجھنا چاہیے اور انھیں لگان دیتے وقت ان سے رسید بھی لینی چاہیے.....' تو اس کے جواب میں 'ہوری' اسے سمجھاتا ہے کہ بیٹا بڑے لوگوں کے بارے میں ایسا نہیں کہتے، وہ ہمارے مائی باپ ہیں، ہمیں ان کے بارے میں کچھ کہتے

سے محتاط رہنا چاہیے۔''

تو وہ اس خیال کو اس کی کم عقلی، خون کے جوشیلا ہونے، یا جہالت سے تعبیر کرتے تھے۔ یعنی ان کے اندر انقلابی روح بیدار کرنا اور اس کے بیدار ہونے کے تمام امکانات مفقود ہو چکے تھے۔ وہ اس کے متعلق سوچتے وقت بھی ایسا محسوس کرتے تھے جیسا عرش ہل جائے گا اور آسمان کانپ اٹھے گا۔ یعنی وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے، انھیں تو مشین بھی نہیں کہا جا سکتا تھا، کیوں کہ وہ تو بغاوت بھی نہ کر سکتے تھے، کم سے کم مشینیں باغی تو ہوتی ہیں اور ناک میں دم کر دیتی ہیں۔

گئو دان اس عہد کی سچی داستان ہے جو پتھروں کے زمانے سے بھی بہت آگے آ گیا تھا مگر اس وقت کے انسان کی حالت 'اسٹون ایج' کے لوگوں سے بھی زیادہ خراب اور بری تھی۔ اس کی مثال 'ہوری' کی زندگی ہے۔ جس نے اپنی ساری زندگی محنت و مزدوری میں لگا دی اور دم توڑا بھی تو کھیت میں ہی اور مرتے وقت بھی اس کے ذہن و دماغ پر کھیت ہی سوار تھے۔ کھیت جنھیں وہ 'دھنیا'، 'گوبر'، 'سونا'، 'روپا'، 'جھینی' اپنے بیلوں بلکہ گھر کے ہر فرد سے اہم سمجھتا تھا، اسے حالاں کہ ان کھیتوں سے کچھ حاصل نہ ہوا، اس کے مرنے کے بعد لالہ نے انھیں دوسرے مزدور کے حوالے کر دیا، مگر 'ہوری' کے لیے وہ سب کچھ بہت کچھ تھے۔ اسی کے ساتھ اس کے جذبات بھی نہایت معصوم تھے، وہ اس بھری پری، ہوشیار، چالاک، فریبی، دغا باز دنیا میں بھی نہایت سیدھا انسان تھا۔ اس کی ایک معصوم تمنا اور تھی کہ اس کے گھر کے سامنے گائے بندھ جائے۔ اسے زندگی نے اگر کچھ دیا، یا نہ دیا، کوئی غم نہیں، کوئی دکھ ہاں! اگر گائے نہیں ملی تو اس کا مقصد زیست ہی بے کار ہے، اس کا جینا مرنا کسی کام نہیں، اس کی ساری زندگی لاحاصل ہے۔ اس کے لیے وہ ادھار گائے لینے سے بھی نہیں

www.urduchannel.in

چوکتا۔ گائے کے حصول کے لیے وہ اپنے پڑوسی کو مطالبے سے زیادہ بھوسا دے دیتا ہے۔ اس کے بعد جب اس کے گھر گائے بندھ جاتی ہے تو اس کی اور اس کے گھر والوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ وہ اس طرح ناچتے، گاتے، کودتے، پھاندتے ہیں جیسے انھیں 'گنج قارون' حاصل ہو گیا ہو۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسوں، چہروں پر زندگی کا تاثر، اعصاب میں سچی حرکت و عمل، جذبات میں حقیقت، کیا کچھ دیکھنے کو نہیں ملتا اس وقت۔ ان احساسات و جذبات کی سچائی نے ناول 'گئودان' کو عظیم ناول بنا دیا۔

ناول 'گئو دان' میں تمام بڑے ناولوں کی خوبیاں موجود ہیں۔ اس کا پلاٹ انوکھا، اسلوب نہایت عمدہ، اس کے کردار اپنے وقت اور حالات کے سچے عکاس اور حقیقی بیان، اپنے پارٹ ادا کرنے میں کسی قسم کی کمی نہ کرنے والے، ان کی باتیں ان کی سیرت، کریکٹر، مجموعی احوال، نئی اور پرانی نسل کے مابین فکری اور عقلی تفاوت، بڑوں کی معصوم حکمت عملی اور نوجوانوں میں پرانی روایتیں توڑنے کا جوش و جنون جس کی مثال 'گوبر اور جھینی' کی وہ جرأت ہے جس نے گاؤں میں بھر میں ایک بار تو 'ہوری' کا سر ہی نیچا کر دیا تھا، یہاں تک کہ معمولی حیثیت کے لوگ بھی اس کے منہ پر باتیں کہہ کر جاتے تھے اور وہ بس دیکھتا رہ جاتا۔ مگر پھر جب وہی بیٹا شہر سے واپس آتا ہے، مرزا خورشید کی عنایات اسے اچھا پورا نوجوان بنا دیتی ہیں تو وہی پھر ماں باپ کی آنکھ کا تارا بن جاتا ہے۔ ایسا ہر گھر میں ہوتا ہے اور یہ روایت بالخصوص ایسے طبقات و افراد میں بار بار دہرائی جاتی ہے۔ 'ہوری' کی لالہ جی سے ملاقات، اس کا اس کے پاس آنا جانا اور دو باتیں کرنے کی سعادت حاصل کرنا، اس کے گاؤں والوں کے لیے مصیبت بن گیا۔

'ہوری' کے گھر گائے کیا آئی کہ اس کے وہ بھائی اس کے دشمن ہو گئے جنھیں 'دھنیا' نے اپنا دودھ پلایا اور 'ہوری' نے انھیں لوریاں سنا کے سینے سے چمٹا کر سلایا تھا۔ وہ بھائی اس سے جلنے لگے اور مارے حسد کے اس کی جان کے دشمن ہو گئے۔ ان کی دشمنی اس قدر بڑھی کہ انھوں نے سازش کر کے بڑے بھائی کی گائے کو زہر دے دیا۔ گائے تڑپ تڑپ کر مر گئی

،اس کے بعد ہوری اوراس کے پورے خاندان پر جیسے کڑکڑا کر بجلیاں گر پڑی ہوں، ہر کوئی رو رہا تھا اور سچے دل سے آنسو بہا رہا تھا۔مگر اب کیا ہوسکتا تھا، ہوا وہی جو بے ایمان بھائیوں نے سوچا۔اس کے بعد ہوری کی کائنات اوراس کی رونق ایک ایک کر کے ختم ہونے لگی۔

ناول 'گئودان' عصر حاضر کا ایک استعارہ بھی ہے۔آج بھی کسی نہ کسی حد تک وہی صورت حال باقی ہے۔وہی طبقاتی بلندی، اونچ نیچ کے تصورات اوران پر مبنی تفریق۔ہاں !اس کی صورت بدل گئی جس سے راست ایسا محسوس نہیں ہوتا بلکہ جب احساس ہوتا ہے اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔پروفیسر قمر رئیس اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> 'گئودان ہمارے سماج کی وہ قدیم سچائی ہے جس میں آج بھی سر مو فرق نہیں آیا، ہاں !اس کی نوعیت اور شکل ضرور بدل گئی جس سے راست وہ صورت حال پیدا نہیں ہوتی بہت دیر بعد اس کا احساس ہوتا ہے۔آج بھی ہمارے معاشرے میں ہوری اور اس کے بھائی مختلف صورتوں میں موجود ہیں۔ان سے ہم کتنا ہی دامن بچالیں، بچ نہیں سکتے، ان کی اچھائی یا برائی ہمیں ضرور پہنچ کر رہے گی۔'

پروفیسر قمر رئیس کی اس گفتگو سے اس گہرائی اور گیرائی کا پتا چلتا ہے جس سے دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ہمارے سماج میں وہ برائی آج تک بھی موجود ہے، جو 'گئودان' کی بین السطور سے ہویدا ہوتی ہے۔جس نے ایک غریب گھرانے کو پے در پے ستم پہنچا کر بالآخر حصوں بخروں میں تقسیم کر کے رکھ دیا۔وہ برائی جس نے 'ہوری' جیسے عزم و ہمت کے پتلے کو بالکل توڑ کر رکھ دیا۔جس نے اپنی زندگی میں نہ جانے کتنے لُو کے جھٹکے کھائے ہوں گے مگر جب ان کی ہمتوں کا دم اپنوں نے توڑ دیا تو ایک ہلکا سولُو کا جھونکا اس کے جسم میں آگ بھرتا چلا گیا۔

گئودان کی معنویت اس طور پر بھی ہے کہ اس میں جن نکات کو موضوع بحث بنایا جنھیں عام طور پر ایسے طبقات نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالاں کہ جن حالات میں 'روپا' کو اس سے دگنی عمر کے شخص کے جس طرح پلے باندھا گیا، وہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا جسے نظر انداز کر دیا

www.urduchannel.in

جاتا، یا 'گوبر' اور 'جھینی' کا مسئلہ، مگر چوں کہ ان سماجوں میں اس طرح کی وارداتیں 'برائی' اور کوئی بہت اہم باتیں نہیں سمجھی جاتی تھیں، اس لیے عام اور معمول سی تھیں، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے کہ جس طرح سے وہ لوگ سمجھتے تھے یا سوچتے تھے، ایسے ہی ہر کوئی سمجھتا اور سوچتا ہے، بالخصوص حساس اور دردمند دل والے افراد، ان کے لیے تو یہ مسائل روح فرسا ہیں اور ہوش ربا بھی، چنانچہ اگر وہ انھیں بدل نہیں سکتے تو ان کی مخالفت میں ضرور آجاتے ہیں۔اپنی تحریر اور تقریر میں انھیں لکھ کر وہ مہذب دنیا کو بدحال لوگوں کی حقیقی زندگی دکھاتے ہیں۔تا کہ انھیں احساس ہو کہ، ان ہی کی دنیا میں، ان ہی کے عہد میں ایسے افراد بھی جیتے ہیں جن کی زندگیاں موت سے بدتر ہیں اور جن کی سانسیں درد سے ٹوٹتی ہوئی گزرتی ہیں۔

'گئودان' محض ایک ناول نہیں کہ، پڑھ لیا گیا اور اسے طاق میں سجا دیا گیا، بلکہ ایک دستور العمل اور منشور حیات ہے، جس کی روشنی میں ہم اپنی زندگیوں کا لائحۂ عمل تیار کر سکتے ہیں۔انسانیت کی تاریخ کا ایک حصہ ہے، جس سے سیکھ کر ہم ان مسائل و حالات سے آگاہ ہو سکتے ہیں جن سے ناداری اور غربت کے عالم میں نوع انسانی کے ایک طبقے کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ایک حقیقت ہے جس سے نظریں چرائی نہیں جاسکتی۔ایک درد ہے جس نے دلوں اور سینوں کو چھلنی کر دیا۔ایک احساس ہے جس سے فکرمندی کے نئے در وا ہوتے ہیں۔ان تمام محرکات و عوامل نے 'گئودان' کو اردو ادب کی تاریخ کا ایک شاہ کار ناول بنا دیا اور رہتی دنیا تک کے لیے اسے زندگی بخش دی۔

مآخذ و مراجع

پریم چند۔منشی۔گئودان (متن) کانپور۔زمانہ پریس۔1940

اعوان۔وسیم۔گئودان: ایک استعارہ۔ماہنامہ شعروادب، لاہور۔اکتوبر:1980

گئودان:: پریم چند کی تحریریں۔سیریل بائی گلزار۔پیش کش: ڈی ڈی نیشنل۔2013

مجروح سلطان پوری۔غزل۔ممبئی۔آواز پبلی کیشن ہاؤس۔1995

✸ ✸ ✸

نظم 'بچے کی دعا' اور بچوں کی نفسیات

حکیم الامت علامہ محمد اقبال کی نظم 'بچے کی دعا' نہ صرف اردو ادب نظموں میں ایک قابل قدر اضافے کی باعث ہے بلکہ بچوں کی معصوم نفسیات کی بھی ترجمان ہے۔ بچے کس طرح بچپن میں مضبوط اخلاقی بنیادوں پر سوچتے ہیں اور ان کے دلوں میں پلنے والی کیسی کیسی معصوم تمنائیں لبوں پر آتی ہیں جنھیں وہ دعا کہہ کر ہاتھ اوپر اٹھا کر رب سے مانگنے لگتے ہیں۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بچے فطرتاً علم کے شیدائی اور انجان چیزوں، باتوں اور مخفی اصولوں کی حقیقت کے متلاشی بھی، اسی طرح طبعاً وہ نرم دل اور مہربان صفت ہوتے ہیں۔ نیز ان کے معصوم دلوں میں سب کے لیے محبتیں ہوتی ہیں۔ بچوں کے متعلق اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ کہیں دیکھتے ہیں کہ کوئی بڑی عمر کا یا کمزور آدمی کوئی بھاری اور اپنی طاقت سے زیادہ کام کر رہا ہے، تو وہ دوڑ کر اس کا ہاتھ بٹانے لگتے ہیں۔ اسی طرح وہ دیکھتے ہیں کہ کسی کمزور اور ضعیف پر ظلم کیا جا رہا ہے تو ان سے نہیں رہا جاتا مگر ان کی طاقت اور بساط چونکہ ظالم سے کئی گنا کم ہوتی ہے، وہ دل مسوس کر ہی تو رہ جاتے ہیں پھر اپنے دل میں پختہ عزم کر لیتے ہیں کہ وہ بڑے ہو کر دنیا کے تمام ظالموں کا خاتمہ کر دیں گے۔ اسی طرح بچوں کو کوئی اندھا یا

www.urduchannel.in

بوڑھا آدمی سڑک / راستہ پار کرتا نظر آتا ہے تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر پار کرا دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ عمل طفلاں باعث نیکی، ثواب اور سعادت مندی ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی بچے اپنے دلوں میں ایک ایسی مسرت اور خوشی محسوس کرتے ہیں جیسے انھوں نے ساری انسانیت کو تباہ ہونے سے بچا لیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی بچے کسی جزا یا صلے کی پروا کیے بغیر ان نیکیوں کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی تمنا کرتے ہیں۔

یوں تو بچے شرارتی بھی ہوتے ہیں مگر وہ اسے فطری عمل نہیں کہا جا سکتا کیونکہ بچے یہ سب بڑوں سے ہی سیکھتے ہیں۔ بڑوں کا نامناسب ماحول ان کے معصوم دلوں میں شیطانیت بھر دیتا ہے۔ چونکہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر بڑے نیک اور سعید ہیں تو ان کے بچے بھی نیک اور صالح ہوتے ہیں۔

اسی طرح جب بچوں کا شعور کچھ آگے بڑھتا ہے تو ان کے دلوں میں امنگوں کے دریا جوش مارنے لگتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم قوم ملت کے سپاہی بن جائیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ہم 'آسمانوں' کو اسرار نہاں سے واقف ہو جائیں۔ زمین کے خزانوں سے آگاہی حاصل کریں۔ ان کی آرزو ہوتی ہے کہ ہم علم و دانش حاصل کر کے اپنی قوم، وطن اور تمام انسانیت کے لیے کارآمد بنیں۔ انھیں بہت پہلے ہی اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ ہمیں اس دنیا کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور دینا ہے۔ ان لوگوں کی طرح نہیں ہونا ہے جو دوسروں کی بنائی ہوئی اشیا، اسلحہ جات، سامان راحت، اسباب خورد و نوش وغیرہ پر بھروسہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں، بلکہ ان جواں ہمت بچوں کے ارمان ہوتے ہیں کہ دنیا انھیں ان کے کارناموں سے پہچانے اور ان کا نام رہتی دنیا تک باقی رہے۔ وہ مصلح قوم۔ تحریکوں کی رگوں میں روح پھونکنے والے۔ ملک و قوم کی آبرو پر قربان ہو جانے والے۔ سائنس داں، استاذ، بہتر سیاست داں، کھلاڑی وغیرہ بننا چاہتے ہیں۔ یہ بچے ان تمام خوبیوں کو حاصل کرنے کی تمناؤں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ ''یارب! ہمارا کام غریبوں کی

حمایت کرنا اور دردمندوں وضعیفوں سے محبت کرنا بھی ہو، جنھیں آپ کی دنیا کے مال داروں نے نظر انداز کر رکھا ہے اور ان کا وجود ان سے برداشت نہیں ہوتا اسی طرح وہ انھیں اپنے آس پاس بٹھانا بھی پسند نہیں کرتے۔ مگر ہمیں آپ ایسی انسانیت کش باتوں سے بچایئے گا اور ہاں! اللہ پاک، دنیا میں کتنی برائیاں ہیں، قدم قدم پر غلطیوں اور خطائیوں کے امکانات ہیں۔ آپ ہمیں ان برائیوں سے بچا کر نیک راہ پر چلایئے گا۔ جسے آپ نے 'صراط مستقیم' کا عنوان دیا ہے۔ ہماری معصوم دعا ہے یارب!

یقیناً ایسی نیک اور ایمانی آرزوئیں رکھنے والے بچوں کا وجود ہمارے ملکوں، وطنوں، دنیا اور جہان کے لیے روشنی اور زینت کا باعث بنتا ہے۔

''بچے کی دعا'' میں اقبال نے بچوں کی ان ہی نفسیات کو مدنظر رکھا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یا رب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
میرے اللہ! ہر برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اسی رہ سے پہ چلانا مجھ کو

✸ ✸ ✸

www.urduchannel.in

کرشن چندر:

فخر بھرت پور

راجستھان کا مشرقی شہر اور سابق راج پوتانہ کی ریاست 'بھرت پور' اپنی علمی و ادبی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں ہے۔ یہ شہر وہ ہے جہاں مرزا غالبؔ اور میر تقی میرؔ جیسے دنیائے شعر و ادب کے شہنشاہ آ کر مقیم ہوئے تھے اور انھوں نے بار بار اس شہر کو شرف بازیابی بخشا تھا۔ برج کے علاقے کا شہر بھرت پور اس کے علاوہ اپنے خوبصورت باغات، گھنے جنگلوں، اونچے پہاڑوں، قدرتی خزانوں، جاذب نظر قلعوں اور شاندار محلات کے لیے بھی دنیا بھر میں مشہور ہے نیز یہاں ایشیا کی سب سے بڑی برڈ سنچری 'کیولا دیو نیشنل پارک' بھی موجود ہے۔

اسی شہر بھرت پور میں فخر بھرت پور معروف افسانہ نگار اور اردو۔ ہندی کے معتبر ادیب، کرشن چندر 23 نومبر 1914 کو پیدا ہوئے۔

کرشن چندر تا عمر ادب عالیہ کے دامن کو افسانوی ادب اور مختلف تحریروں کے لعل و گوہر سے بھرتے رہے اور دنیا بھر میں اپنے وطن کا نام روشن کرتے رہے۔ ترقی پسند تحریک سے جڑ کر تو ان کا فن اور نکھر گیا اس طرح جانبین کو بھرپور فائدہ بھی ہوا، کرشن چندر نے ترقی پسند

تحریک کو اعتبار بخشا اور ترقی پسند تحریک نے کرشن چندر کو بام عروج پر پہنچایا۔ یا یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کرشن چندر ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی دَین ہیں اور ان کی تحریریں اردو ادب میں اعلامرتبے پر فائز ہیں۔

کرشن چندر اس میدان میں تنہا تھے مگر ان کے تاریخی اور یادگار افسانوں و کہانیوں نے انھیں بہت جلد حقیقی معنوں میں انجمن بنا دیا۔ انھوں نے جہاں اردو ادب کے خزانے میں قابل فخر اضافہ کیا اور اپنی بہترین و یادگار تخلیقات سے مالا مال کیا وہیں ہندوستان کی قومی زبان ہندی کے بھی مسلّم ادیب مانے گئے۔

کرشن چندر کا اسلوب نگارش اور فنی گرفت اتنی دل کش تھی کہ محض دو چار کہانیوں کے بعد ہی دنیا نے ان کی عظمت تسلیم کر لی تھی۔ انھوں نے اپنے وقت کا المیہ بیان کرنے کے لیے نہ صرف ناولوں اور افسانوں کا سہارا لیا بلکہ مختصر کہانیوں، ڈراموں، رپورتاژ، انشائیوں مختصر افسانوں اور ادب اطفال بلکہ تمام اصناف ادب کو اپنایا۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ ہمارے سماج، معاشرے، ملک اور قوم کے حالات ہر حال میں حکومت کے ذمے داروں اور ایوان بالا کے مکینوں تک پہنچ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس قدر قلمی جواہر چھوڑے ہیں ان کی مثال نہیں ملتی۔

ایسا نہیں ہے کہ جس وقت کرشن چندر ناول یا افسانے لکھ رہے تھے اس وقت وہی واحد ادیب تھے بلکہ ان کے معاصرین میں اردو فکشن نگاروں کی کہکشاں موجود تھی جن میں حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، دیویندر ستیارتھی، راجندر سنگھ بیدی،، خواجہ احمد عباس، احمد ندیم قاسمی وغیرہم جیسے قد آور ادیب اور افسانہ نگاروں کا نام نامی لیا جاتا ہے۔ ان سب کا اپنا اپنا جہان تھا مگر کرشن چندر کا جہان ان ستاروں سے بھی آگے تھا۔

www.urduchannel.in

سوال ہوسکتا ہے کہ کرشن چندر نے اردو ادب کو ایسا کیا انوکھا دے دیا جو اُن کا ڈھونڈورا زور شور سے پیٹا جا رہا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کرشن چندر وہ واحد ادیب ہیں جنھوں نے بیک وقت کہانی، ادب اطفال، مختصر افسانے، افسانے، ناول، ڈرامے، انشائیے، خاکے، مضامین، تنقیدی و مزاحیہ مضامین، طنزیے، دیباچے۔ فلمی کہانیاں، انتظاریے، رپورتاژ، سفرنامے، ریڈیو کومنٹریز جیسی تحریریں کا کولاژ اردو دنیا کو دیا اور گلشن اردو کی آبیاری کی ایک کامیاب اور مکمل کوشش کی۔

دوسری بات بقول پروفیسر محمد حسن یہ ہے کہ:

> ''لفظوں کا سب سے بڑا جادوگر (اور شناور) کرشن چندر تھا۔ جس کے قلم سے نکلنے والا ہر لفظ لودے اٹھتا تھا۔ کرشن چندر کے لیے لفظ کبھی کھیل نہیں رہے۔ ان گنت پرتیں اور بے شمار تہیں رکھنے والے نگینے تھے۔ جنھیں وہ ایک ماہر فن مرصع ساز کی طرح پرکھتے تھے۔ ان سے ہزاروں رنگ کے مرقع بناتے، شعائیں پیدا کرتے تھے، خیال کے ایسے مرکبات بناتے بگاڑتے تھے کہ افسانہ یا مقالہ کسی سائنس داں کا معمّل (Leboratory) معلوم ہوتا تھا۔''

تیسری بات یہ کہ کرشن چندر وہ واحد ادیب تھے کہ جن کے فن، آرٹ، تکنیک اور تحریروں کے بیک زبان تمام ناقدین اردو ادب معترف تھے۔ جن میں علی سردار جعفری۔ پروفیسر احتشام حسین۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ صلاح الدین احمد۔ پروفیسر فیاض احمد ایم۔ اے۔ عزیز احمد۔ ڈاکٹر عبادت یار خاں عبادت بریلوی اور احمد صدیق مجنوں گورکھپوری وغیرہ کا نام نمایاں ہے۔

اگر مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو کرشن چندر نے اپنے تصنیفی سفر میں 47 سے زائد ناول، 30 مختصر کہانیاں، 32 افسانوں کے مجموعے، چھے ڈراموں پر مشتمل ایک مجموعہ اور ریڈیو کے لیے متعدد کومینٹریز تحریر کیں۔ اسی دوران ان کی ہمہ گیر شہرت جب بالی وڈ تک

پہنچی تو ہندوستانی فلم صنعت نے بھی ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ وہ نہ صرف ایک افسانہ نگار تھے بلکہ طنز و مزاح میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ چنانچہ اس کی شہادت کے لیے ان کی مزاحیہ تحریر 'ایک گدھے کی سرگزشت' اور اسی قبیل کے دیگر مضامین موجود ہیں، جو تمام طنز و مزاحی فن کی خوبیاں لیے ہوئے ہیں اور قارئین کی مکمل دل چسپی کا سامان ان میں موجود ہے۔

یہ کمال صرف کرشن چندر کو حاصل ہے کہ ان کے ناولوں کی مقبولیت کے پیش نظر تقریباً 16 ہندوستانی زبانوں اور انگریزی سمیت متعدد غیر ملکی زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے ہیں۔

کرشن چندر کو قحط بنگال کے موقع پر لکھے گئے افسانے 'ان داتا' سے عالم گیر شہرت حاصل ہوئی اور اسی سے متاثر ہو کر خواجہ احمد عباس نے 1946 میں فلم 'دھرتی کے لال' میں 'ان داتا' کی اسکرپٹ کو من و عن اپنایا۔

کرشن چند کے فن کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو کہا جائے گا کہ وہ اپنی کہانیوں میں تاثر کی وحدت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ یعنی ایک خیال ان کے ذہن میں ایک مکمل تاثر بن کر ابھرتا ہے اس کے بعد وہ کاغذ پر اتر کر پھیلنے لگتا ہے اور اس طرح پوری کہانی پر چھا جاتا ہے۔

المیہ تقسیم کے تناظر میں کرشن چندر کا ناول 'ہم وحشی ہیں' وہ شاہ کار ناول ہے جس کی نظیر ادبیات عالم میں نہیں ملتی۔ انھوں نے ان آگ آگ، دھواں دھواں اور خون خون حالات میں وہ ناول لکھا جب انسانیت کا نام لینا گناہ عظیم تھا۔ ہندوستانی سرزمین پر شیطان اپنے پورے لشکر سمیت اتر آیا تھا اور انسانوں کے خوں خوار طبقے نے زمین کو فساد سے بھر دیا تھا۔ اس ناول نے اپنی اشاعت کے بعد سے جیسے ہندوستانی قوم اور مہاجرین کے ساتھ بدسلوکی و زیادتی کرنے والے بلوائیوں کی کارروائیوں پر پانی چھڑک دیا ہو۔

www.urduchannel.in

انسان کیسے وحشی ہو جاتا ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ خوں خوار وہ ان دنوں عام سی بات ہو گئی تھی۔ کرشن چندر کے اس ناول نے اس حیوانیت پر نہ صرف قدغن لگائی بلکہ انسانوں کو وحشیت ازم سے نکال کر پھر سے انسانیت کا درس دیا۔

ایک بات کرشن چندر میں خصوصیت کے ساتھ موجود تھی وہ ان کا طرز تحریر تھا جس کے بارے میں عزیز احمد کہتے ہیں:

> ''جہاں تک طرز تحریر کا تعلق ہے اردو کا کوئی افسانہ نگار کرشن چندر کی گرد تک نہیں پہنچ سکتا۔ درد ہو یا طنز، رومانیت ہو یا حقیقت نگاری ان کا قلم ہر موقع پر ایسی دلکش چال چلتا ہے جو بانکی بھی ہوتی ہے اور انوکھی بھی۔''

مذکورہ بالا خصوصیات کے سبب کرشن چندر کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے جو اپنی زندگی میں ہی ایک روایت بن گئے تھے۔

یوں تو کرشن چندر کی پیدائش راج پوتانہ کی مردم خیز ریاست بھرت پور میں ہوئی جہاں ان دنوں ان کے والد، گوری شنکر چوپڑا، میڈیکل خدمات انجام دے رہے تھے۔ جیسا کہ دہلی میں مقیم کرشن چندر کے چھوٹے بھائی اوپیندر چوپڑا کہتے ہیں مگر ان کی تمام تر تعلیم و تربیت کا شرف لاہور کو حاصل ہے۔ اس شہر نے کرشن چندر کی اس طرح آؤ بھگت کی کہ وہ وہ وطن اصلی کو بھول گئے اور لاہور ایسا بھایا کہ وہ کہہ اٹھے:

> ''لاہور نہ صرف میرا مادر علمی ہے بلکہ یہاں سے میں نے شہرت بھی حاصل کی۔ اس شہر نے مجھے اور میرے خاندان کے لوگوں کو وہ پیار دیا کہ ہمارے لیے لاہور بھولنا مشکل ہے۔ لاہور دنیا میں ایک یہ چمکتے ہوئے ستارے کی مانند ہے اور ہماری روح میں اس کی خوشبو بسی ہوئی ہے اور اس کی عظمت ہمارے دل میں قیمتی زیورات کی طرح ہے۔''

مگر کرشن چندر تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے والد کے ہمراہ لاہور کی سکونت ترک کر کے

مہاراجہ پونچھ کے ڈاکٹر کے طور پر کام کرنے لگے۔ جہاں انھوں نے اپنا شاہ کار ناول 'شکست' تحریر کیا جس کا موضوع کشمیر کی تقسیم سے متعلق تھا۔ ان کا شہرہ آفاق ناول 'مٹی کے صنم' بھی ایک کشمیری نوجوان کے بچپن کی یادوں کے متعلق ہے۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو کرشن چندر کے بیشتر افسانے کشمیری دیہاتیوں کی کہانیوں کے ساتھ ساتھ بے گھر تارکین وطن اور بنجاروں کی زندگیوں کا بیان ہیں۔

کرشن چندر کی تمام خوبیوں میں یہ خوبی بہت نمایاں تھی کہ وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے پجاری تھے اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ مشرقی تہذیب کے حاملین، ہندو ہوں یا مسلمان، وہ کسی غیر ملکی اور کلچر کے دشمن کی باتوں میں نہ آئیں بلکہ پرتشدد حالات میں بھی درمیانی اور امن کی راہ نکالنے کی کوشش کریں۔ وہ خود پوری عمر اپنی تحریروں کے ذریعے یہی کرتے رہے۔

پھر ایک دن وہ آیا 8 مارچ 1977 کا دن، جس دن فخر بھرت پور کرشن چندر ممبئی کی آغوش میں سما گئے اور اردو دنیا نہ صرف ان کی زریں خدمات سے محروم ہوئی بلکہ فرقہ وارنہ ہم آہنگی اور امن و آشتی کے خوگروں کو بھی سخت جھٹکا لگا، وہ اپنے ایک بازو سے محروم جو ہو گئے تھے۔

www.urduchannel.in

عصمت خانم چغتائی:

تاریخ اردو ادب کا تابندہ ستارہ

اردو ادب کی یہ خوش قسمتی ہی ہے کہ اول عہد سے ہی اس کی کمان ایسے ہاتھوں میں رہی ہے جنھوں نے اسے فروغ دینے اور وسعت بخشنے میں کسی طرح کی کمی نہیں چھوڑی بلکہ اسے اپنی جاں سے عزیز تر سمجھتے ہوئے عمر عزیز کا ایک حصہ اس کے لیے وقف کر دیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے اس کے لیے منصوبہ بند اور منظّم ضابطے اختیار کیے جن کی بدولت آج اردو زبان اور اس کا ادبی سرمایہ دنیا کی بڑی زبانوں کی ہمسری کر رہا ہے۔ حالاں کہ اردو ادب کی شاندار ادبی تاریخ کا عہد ڈھائی سو برس سے زیادہ نہیں ہے اس کے باوجود اردو میں گوناگوں موضوعات، متعدد اصناف، مختلف جہات اور بھانت بھانت کے رنگ روپ لے کر عالمی زبانوں کے اپنی موجودگی درج کراتے ہوئے ہے۔ مناسب ہوگا کہ اردو سے زیادہ ان لوگوں کی تعریف کی جائے جنھوں نے آج اردو کو اس مقام تک پہنچایا ہے۔

عصمت چغتائی (1991--1915) کا شمار ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے، جن پر بلا شبہ اردو ادب اور تاریخ اردو ادب کو ناز ہے۔ انھیں اگر تاریخ اردو ادب کا تابندہ ستارہ کہا

جائے تو غلط نہ ہوگا۔عصمت کا انداز اپنے معاصرین سے یکسر الگ اور جداگانہ تھا۔ان کی سب سے بڑی امتیازی خصوصیت 'ادبی دائروں' میں رہ کر حقیقت بیانی، بے باکی، حق گوئی اور سچی بات کہنا تھا۔جس میں انھوں نے کبھی ٹال مٹول، حیص بیص، اقربا پروری، اعلا وادنی اور حاکم ومحکوم کے مابین تفریق سے کام نہیں لیا بلکہ جو کچھ جہاں اور جیسے دیکھا اس کی پردہ پوشی کرنے کے بجائے بیان کر دیا۔اس بات پر ان کی لاکھ مخالفتیں ہوئیں، کروڑوں بار انھیں برا بھلا کہا گیا، ان کے خلاف مقدمے دائر کیے گئے اور چلے۔مگر انھوں نے کسی کی پروا نہ کی اور اپنی ڈگر پر چلتی رہیں۔یہاں تک کہ انھوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی خامیوں بھی کو بلاکم وکاست ''دوزخی'' میں بیان کر دیا اور ملمع سازوں یا اپنوں کی برائیوں کی پردہ پوشی کرنے والوں کے سامنے ایک لاجواب مثال پیش کر دی۔یاد رہے کہ عظیم بیگ چغتائی ہی وہ ہیں جنھوں نے عصمت کو افسانے پڑھنا اور قلم پکڑنا سکھایا تھا ورنہ تو وہ کھلاڑی بنتی یا موڈرن گرل۔نہ گھر کی نہ گھاٹ کی۔

اردو افسانہ نگاری کے عنوان سے بھی عصمت چغتائی کا نام ان لوگوں میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے اس صنف میں زرین نقوش ثبت کیے ہوں۔واقعہ یہ ہے کہ اردو افسانہ نگاری کا باب عصمت چغتائی کے تذکرے کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوسکتا۔ان کا اپنا الگ انداز تھا اور جداگانہ طرز، بالخصوص متوسط مسلم گھرانوں کی زبان اور رسوم ورواج ورہن سہن اور اس طبقے کی نفسیات پر تو انھیں عبور حاصل تھا۔کہتے ہیں کہ انھوں نے علی گڑھ کی تعلیم کے دوران متوسط گھرانوں کی لڑکیوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور انھوں نے ان کے ذاتی معاملات میں دل چسپی بھی لی تھی جو اُن کے فن اور طرز کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوئی۔چنانچہ ان کے افسانوں کے حوالے سے ہم ان گھرانوں کا معائنہ کر سکتے ہیں، اسی طرح اس عہد کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں جس عہد کے یہ فسانے ہیں۔بلا شبہ اردو ادب کے ساتھ ساتھ

www.urduchannel.in

راجستھان اور علی گڑھ کو بھی ان پر ناز ہے۔

عصمت چغتائی پر ان کے ناولوں اور افسانوں کے حوالے سے سب سے زیادہ جنس نگاری کا الزام پہلے بھی لگایا گیا اور لحاف کو تو ایک مذاق بنا کر رکھ دیا گیا۔مذاق بھی بھدا اور بے ہودہ۔اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور انھیں اس حوالے سے جی بھر کے کوسا جاتا ہے عالم یہ ہے ''لحاف'' سنتے ہی سنجیدہ قسم کے لوگ بھی منہ پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں اسی طرح، حقیقت پسند بھی انھیں مطعون کرنے سے نہیں چوکتے حالاں کہ یہ مناسب طرز اور درست بات نہیں ہے اس لیے کہ حقیقت بیانی اور حقیقت شناسی تو انسان کا پیدائشی خاصہ ہے وہ ازل سے ہی حساس واقع ہوا ہے، برائیاں اس کی آنکھوں میں چبھتی ہیں اور گندگیوں سے اسے فطری نفرت ہے۔اب جو جیسا دیکھتا ہے اسے اسی طرح بیان کر دینے پر چراغ پا ہونا کیسا۔ بالخصوص اس وقت جب کہ کسی انسان کا مقصد ہی حقیقت بیانی ہو اور وہ سماج میں پنپ رہے جرائم وخرافات اور غلط کاریوں کو بے نقاب کرنا چاہتا ہو۔اس سلسلے میں جب عصمت چغتائی سے راست پوچھا گیا اور جنسی موضوعات اور عریانی نگاری کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا:

> ''آپ ادب کی عریانی سے لرز جاتے ہیں۔یہ نہیں دیکھتے کہ ادب خود دنیا کی عریانی سے لرزا اٹھا ہے اور وحشت کے مارے کانپ رہا ہے۔''

گویا عصمت کہنا چاہتی ہیں کہ جب خود ادب پر ہی عریانی کی گندگی ڈال دی گئی لہٰذا کے مرض میں مبتلا ہو گیا تو اس سے وابستہ لوگ یا اس کے نوک پلک سنوارنے والے، کیوں کر اس کی کثافت سے بچ سکتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے چوں کہ عصمت چغتائی تو ادب میں مقصدیت کی قائل تھیں وہ ادب کو وقت گزاری اور سامان تفنن نہیں سمجھتی تھیں اس لیے ظاہر سی بات ہے کہ وہ ایسی ہی چیزیں پیش کریں جو چشم کشا ہوں اور انسانیت کو آئینہ دکھائیں۔چنانچہ ان کا قول ہے:

''ادب دل بہلائی نہیں۔ وہ گرام فون نہیں کہ جب دل چاہا بجا لیا۔ اسے تو زندگی کا آئینہ ہونا چاہیے تا کہ وہ جو کچھ دیکھے، بیان کردے۔ معاشرے میں جو چیزیں ہیں انھیں کیوں پوشیدہ رکھا جائے۔''

واقعی، ادب کا حقیقی مقصد پیغام رسانی اور تبلیغ ہونا چاہیے، نیز اسے اصلاح اور نیکی کے داعی کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اچھے لوگوں کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ اپنے قلم، فن اور روزگاروں کو بھی آلۂ پیغام رسانی اور تبلیغ حق وانصاف وسچائی بنا لیتے ہیں۔

''لحاف''۔ ''بھول بھلیاں''۔ ''تل''۔ ''گیندا''۔ ''بچھو پھوپی''۔ ''ننھی کی نانی''۔ ''دو ہاتھ''۔ ''زہر کا پیالہ'' وغیرہ عصمت چغتائی کے ایسے افسانے ہیں جنھوں نے اپنے وقت میں ایسی آگ لگائی کہ پیٹرول سے بھی کیا لگتی ہوگی۔ سماج اور معاشرے بھڑک ہی اٹھے۔ ہر کوئی گالیاں دے رہا تھا اور عصمت کی عصمت ریزی کے درپے تھا۔ انتہا یہ کہ ان پر مقدمے تک درج کر دیے گئے۔ عصمت کا جرم بس یہ تھا کہ انھوں نے سماج کے ان ناسوروں پر سے پردہ اٹھا دیا تھا جنھوں نے اسے بیماریوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ مگر عصمت چوں کہ اسی دنیا کی تھیں چنانچہ ان تیز وتند مخالف آندھیوں کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اس لیے انھیں اپنا یہ طرز بدلنا پڑا۔ اس مرتبہ انھوں نے رومانوی اور وقت کے تقاضوں کے مطابق افسانے اور ناول لکھے۔ پیٹ پالنے کے لیے فلموں کے لیے کہانیاں اور اسکرپٹس لکھیں۔ کربلا کے خوں چکا حالات پر مبنی انھوں نے ''ایک قطرۂ خوں'' جیسا عظیم الشان ناول لکھا۔ تقسیم ہند کے قیامت خیز حادثے پر ''جڑیں'' اور ''دھانی بانکیں'' جیسی کہانیاں لکھیں۔ پھر اپنے وقت اور ماحول کے حالات کے مطابق ''ضدی''، ''ٹیڑھی لکیر''، ''معصومہ''، ''سودائی''، ''عجیب آدمی''، ''دل کی دنیا''، ''وغیرہ شاہ کار منظر عام پر آئے۔

زبان ولب ولہجے کے اعتبار سے بھی عصمت کا مقام بہت بلند ہے بلکہ ان کے افسانوں

www.urduchannel.in

کی سب سے بڑی خصوصیت اور دلکشی کا سبب زبان ہی ہے۔ عصمت نے جس جس طبقے، جس جس سماج اور جس جس معاشرے کو اپنی تخلیق کا موضوع بنایا اسی کی زبان اس میں استعمال کی۔ اس وقت تو کہنا ہی کیا جب وہ اس میں طنزیہ انداز اختیار کر لیتی ہیں۔ ایک مقام پر عصمت کی اس خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے ظ۔ انصاری لکھتے ہیں:

''انھیں لکھنا آتا ہے۔ افسانہ سنانا آتا ہے۔ لچکیلی دھار دار زبان آتی ہے۔ نشتر چبھونا آتا ہے.....''

سعادت حسن منٹو کو بھی اس بات پر ناز تھا کہ انھوں نے عصمت چغتائی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ قربت ایسی کہ بعض لوگ ان دونوں کے رشتۂ ازدواج سے وابستہ ہونے کے خواہش مند تھے مگر دونوں کی ضدی طبیعتیں اس کو کہاں برداشت کر سکتی تھیں۔ اگر ایسا ہو جاتا اور بقول منٹو:

''یہ اگر بھی کچھ ایسی قسم کی اگر ہے۔ اگر کہا جائے کہ قلوپطرہ کی ناک ڈیڑھ انچ کا اٹھارواں حصہ بڑی ہوتی تو اس کا اثر وادی نیل پر کیا پڑتا.....''

تو کیا خوب ہوتا۔ مگر ایسا نہ ہوا اور منٹو تصور میں ہی قاضی صاحب کے سامنے عصمت سے ضد میں ہار گئے۔

منٹو عصمت کے قلم کے مداح تھے اور ان کے افسانوں کی تعریف کرتے تھے۔ ان کا یہ شہرہ آفاق جملہ بھولنے کے قابل ہی نہیں ہے جب انھوں نے اپنی بہن اقبال سے کہا تھا:

''تم بھی اگر عصمت جیسا مضمون میرے اوپر لکھ دو تو میں ابھی مرنے کو تیار ہوں.....''

عصمت معاصر شناسی وقدر دانی اور خورد نوازی میں بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ اپنے معاصرین میں وہ سب کی عزت وقدر کرتی تھیں۔ کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، منٹو، قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، ان کے پسندیدہ قلم کار تھے۔

ان کے ناولوں، افسانوں اور نظموں کی وہ دل کھول کر داد دیتی تھیں۔ نوجوان قلم کاروں کو میدان ادب میں آتے دیکھ کر انھیں ایسی ہی خوشی ہوتی جیسے کسی کو اپنے بچوں کو پھلتا پھولتا اور بڑھتا سنورتا دیکھ کر ہوتی تھی۔ ایک دلچسپ مکالمے کی صورت میں وہ خود لکھتی ہیں:

''.....جب جدیدیوں نے لکھنا شروع کیا تو قدرتی طور پر لپک کر انھیں سنبھالنے کو جی چاہا۔ ہر ایک دوسرے پر ٹالنے لگا کہ وہ ایک مدلل مضمون لکھے۔ ''بھئی میں تو نہیں لکھوں گی۔'' میں نے فیصلہ کیا۔ ''کیوں؟'' ''میرے بارے میں جو کچھ لکھا گیا، مجھے ملامتیں دی گئیں، ڈانٹا پھٹکارا گیا تو کب میں نے ان کی سنی۔ فرض کیجیے یہ نئے نوجوان میری سن بھی لیں تو مجھے سخت ناامیدی ہوگی۔'' ''بھئی وہ کیوں؟ کیا بزرگوں کا فرض نہیں کہ وہ نوجوانوں کی رہنمائی کریں؟'' ''سچا ادیب وہی ہے جو رہنمائی سے کترا جائے.....''

ایک جگہ اور کہتی ہیں:

''.....بہت لکھ لیا، اب اوروں کو لکھنے دو۔ نئی نسل کا بھی کچھ حق ہے۔ ہم اپنا ڈھول کب تک پیٹتے رہیں۔''

عصمت چغتائی سیاست پر بھی گہری نظریں رکھتی تھیں۔ دنیا میں کہاں کیا ہو رہا ہے۔ امریکہ اور روس کس بات پر نالاں ہیں اور چائنا سے دنیا کو کیا کیا خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان پاکستان کا مستقبل کیا ہوگا، انھیں سب کا اندازہ تھا۔ سیاسی امور اور سیاسی بازیگروں کے ذریعے عوام کو اُلّو بنانے اور ان کے جذبات سے کھلواڑ کرنے پر انھیں سخت ملال ہوتا تھا۔ ان سے جب کوئی سیاسیات پر بات کرتا ایسا لگتا جیسا بند کھل گیا ہو۔ سچی اور دل کو لگتی باتیں وہ کہتی تھیں۔ سماجی ناانصافیوں اور سیاسی غلط کاریوں پر نا صرف انھوں نے لکھا بلکہ بولا بھی اور ڈنکے کی چوٹ پر بولا۔ قومی یکجہتی کے مکروہ نعروں اور ہندو پاک کی نا مناسب تقسیم اور بے خون خرابے پر ان کی حقیقت افشاں تحریر دیکھیے:

''آج کل قومی یک جہتی پر بہت زیادہ زور دیا جا رہا ہے جیسے ملک کے سارے دکھ قومی یکجہتی نہ ہونے کی وجہ سے تباہی پھیلا رہے ہیں۔ اگر قومی یکجہتی منظور نہیں تو مذہب کے نام پر ملک ہی کیوں تقسیم ہونے دیا اور اگر مذہب کے نام پر تقسیم کی گئی تو اس پر پوری طرح پہلے عمل کیوں نہیں کیا گیا۔ جنھوں نے تقسیم کے لیے ووٹ دیے تو پھر مذہب کے نام پر پہلے سکون سے بٹ جاتے۔ پھر ملک کی آزادی کا جشن منایا جاتا۔ جو پاکستان کے لیے ووٹ دیتے وہ آرام سے چلے جاتے۔ اس میں چند سال لگتے۔ آزادی چند سال بعد ملتی اور اتنا خون خرابہ تو نہ ہوتا.....''

جو لوگ عصمت کو 'کلیم الدین احمد' کی طرح بس ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں میں ان سے کہوں گا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اس چشمے کو ہٹائیں اور اپنی قریب کی نظروں سے عصمت کا وہ جہان بھی دیکھیں جس میں انھوں نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کے سیاسی ڈکیتوں، ہندوستان کے دشمنوں، ظالم سامراجیوں، انسان دشمن نظاموں، سرمایہ داروں، سماج میں ناانصافی پھیلانے والے عناصر، ذات پات اور خاندانی عصبیت اور غریبوں کو پامال کر دینے والوں کے خلاف قلمی جہاد کیا ہے۔ ''غبار کارواں''۔ ''میں چپ رہا''۔ ''بے کندے کی پیالی''۔ ''آدھی عورت''۔ ''آدھا خواب''۔ ''پتھر دل''۔ ''امر بیل''۔ ''سانپ کے تلوے''۔ ''ہم لوگ''۔ ''ہندوستان چھوڑ دو''۔ ''خریدلو''۔ ''نفرت''۔ ''سفید چادر'' وغیرہ ان کے ایسے شاہ کار ہیں جنھیں دنیا کبھی نہیں بھلا سکتی اور نہ ہی عصمت کے قلم کی جرأت کا انکار کر سکتی ہے مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ ازلی یک رخی انسان اور اپنی نظروں کو تنگ رکھنے والا آدمی وہی دیکھنے کا عادی ہے جو اسے دکھایا جاتا ہے۔ نام نہاد نقادوں نے اسے جس راستے پر چلا دیا وہ بس اسی پر گامزن ہے۔ سب سے زیادہ اسی بات کا رونا ہے اور اسی کا ملال بھی۔

عصمت چغتائی پر بڑے دھڑلے اور منہ پھٹ انداز میں الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اردو رسم الخط کو دیوناگری میں تبدیل کرنے کی وکالت کرنے والوں میں سب سے آگے تھیں۔ چنانچہ اس سلسلے رفعت سروش لکھتے ہیں:

www.urduchannel.in

''آزادی کے بعد ہندی کی یلغار سے ہمارے بڑے بڑے ادیب بھی بوکھلا گئے تھے اور انھوں نے اپنی بقا کا یہ راستہ تلاش کیا تھا کہ اردو کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا جائے۔ اس طرح سوچنے والوں اور برملا اظہار کرنے والوں میں خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، علی سردار جعفری اور صف اول کے ادیب شامل تھے۔''

اسی طرح رضوان احمد لکھتے ہیں:

''بھارت میں جب اردو کے لیے دیوناگری رسم الخط کی تحریک شروع ہوئی تو عصمت چغتائی اس میں آگے آگے تھیں۔ صرف اتنا ہی نہیں انہوں نے اپنے تمام ناولوں اور کہانیوں کو ہندی میں شائع کروانے میں بھی پہل کی۔''

حالاں کہ عصمت پر یہ الزام درست نہیں اور سراسر دروغ گوئی ہے۔ بلکہ حقیقت وہ ہے جو خود اُنھوں نے بیان کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں ان ہی خیالات یہاں درج کروں تا کہ سند رہے۔ وہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی کے سوال کا مدلل و مفصل جواب دیتے ہوئے کہتی ہیں:

''.....ہمارا ادب ہندی کی قطار میں کھڑا ہو کر بالکل پٹ جاتا ہے۔ کیوں کہ ادیب لوگ اس کا ترجمہ خود تو کرتے نہیں بلکہ اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کراتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے اور کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ لوگوں نے میری باتوں کو غلط سمجھا۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اردو کا رسم الخط بدلنا چاہتی ہوں۔ حالاں کہ میں کہتی ہوں کہ جب اردو کو ہندی میں منتقل کیا جائے تو ترجمہ کرنے کے بجائے صرف رسم الخط ہندی رہے باقی الفاظ اردو کے ہی رہیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ہم اردو کو چھوڑ دیں بلکہ ہمیں ایک ایسی اسکرپٹ بنانی چاہیے جس میں اردو، فارسی، عربی وغیرہ کے سب کی ساؤنڈ نکل آئے۔ لیکن کوئی نہیں مانا۔ جب انگریزی سے کام چل جاتا ہے تو پھر اس بات کو کوئی کیوں سنے؟.....''

عصمت کا یہ پرکشف بیان چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ ان پر غلط الزام لگایا گیا اور انھیں

www.urduchannel.in

ناحق اردو کو 'دیوناگری کرن' کے حوالے سے مطعون کیا گیا۔ نہ جانے کچھ لوگوں کو کیا ہو جاتا ہے کہ وہ کسی کے خلاف بغیر سوچے سمجھے جانے کیا کیا لکھ دیتے ہیں۔ انھیں اس بات کا بھی احساس نہیں ہوتا کہ ان کے یہ رشحات قلم دیر تک اور دور تک پھیلیں گے اور انھیں ہر طرح کے لوگ پڑھیں گے۔ مگر وہ تو لکھ گئے اور ایسا زہر پھیلا گئے جس کا تریاق ملنا ممکن نظر نہیں آتا۔ یہی مسموم ماحول ادیبوں اور اردو کے سچے خدمت گاروں کو بعد الموت بھی چین نہیں لینے دے رہا ہے۔ کیا اپنے محسنین کو یہی صلہ دیا جاتا ہے۔ فیا للعجب!!

عصمت کو ترقی پسند تحریک سے جذباتی سا لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آزادی کے بعد مکمل طور پر اس کے تانے بانے بکھر گئے تو انھیں بہت صدمہ ہوا۔ حالاں کہ اس وقت پاکستان میں ''حلقۂ ارباب ذوق'' کے نام سے اسی طرز کا ادارہ قائم ہو چکا تھا مگر حلقے میں وہ بات کہاں جو تحریک میں تھی۔ پھر وہ بھی قیوم نظر گروپ سمیت کئی گروپوں میں تقسیم در تقسیم ہو کر معدوم ہو گیا۔ اب کیا بچا تھا۔ یہ سب کچھ عصمت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آپ اندازہ لگایے جس عصمت نے ترقی پسند تحریک کو خون جگر دے کر پالا تھا، وہ ان ہی کے سامنے ختم ہو گئی۔ دل پر کیسی آریاں چلی ہوں گی اور جگر کٹا ہو گا۔ عصمت کا کربناک بیان ملاحظہ کیجیے:

''ترقی پسند تحریک کو ہم نے اپنی جوانی اور خون پسینہ دیا جو اپنے بچوں سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک اب ہے ہی کہاں۔ مستقبل تو اس کا ہے ہی نہیں۔ بس لوگ دل کی تسلّی کے لیے ہی غل مچاتے ہیں۔ منٹو، کرشن چندر، بیدی اور سجاد ظہیر کے ساتھ ہی یہ تحریک ختم ہو گئی.....''

ایک بھرپور، پرتعیش اور آرام بخش زندگی گزارنے کے باوجود بھی عصمت کو یہ احساس تھا کہ وہ زندگی میں اس زمین اور اس کے باشندوں کے لیے ایک بوجھ بن کر رہی تھی پھر مابعد موت وہ کیوں مزید بوجھ بنیں، لہٰذا انھوں نے وصیت کی ان کے جسد خاکی کو نذر آتش کر دیا جائے۔ چند دن راکھ زمین پر رہے گی اور پھر آندھیاں اسے اڑا دیں گی۔ راکھ کے ذرے

زمین کو کہاں بوجھل کرتے ہیں۔

اب عصمت ہیں اور نہ عصمت کا سایہ، وہ راکھ بھی اڑ گئی جس کے ذرات عصمت کا جسد خاکی کے ذرات تھے۔ ہاں! ان کے افسانوی اور ناولوں و ناولٹوں کے مجموعے اردو زبان کی آبرو اور ان کی یادگار بنے ہوئے۔ جن کی تفصیل یہ ہے ایک بات (نو افسانے) چوٹیں (14 افسانے) دو ہاتھ (17 افسانے) ہم لوگ (13 افسانے) آدھی عورت، آدھا خواب (چھے افسانے) عصمت کے شاہ کار افسانے (11 افسانے) لیڈی کلر (نو افسانے) امر بیل (نو افسانے) وغیرہ۔

قارئین کرام! ''**لیڈی چنگیز خاں**'' کا اتنا دردناک انجام اور چنگیز خاں کی نسل میں ایسے خدا بیزار اور دین دشمن فرد کے وجود سے آپ کو سبکی تو ضرور ہوئی ہوگی مگر یہ خود عصمت کا معاملہ ہے، وہ خود سمجھیں اور ان کا خدا سمجھے۔

مآخذ و مراجع

گل، چاند۔ اردو افسانوی ادب کی باغی خاتون عصمت چغتائی سے ملاقات۔ عصمت نقد کی کسوٹی پر۔ نئی دہلی۔ انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن۔ 2006

ماہنامہ پیام جے پور ''عصمت چغتائی نمبر'' 1965

ظ۔ انصاری۔ عصمت میری نظر میں۔ ماہنامہ نظریات، ٹونک۔ 1955

منٹو۔ سعادت حسن۔ عصمت چغتائی۔ عصمت نقد کی کسوٹی پر۔ نئی دہلی۔ انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن۔ 2006

چغتائی۔ عصمت۔ مجھے کہنا ہے کچھ... عصمت نقد کی کسوٹی پر۔ نئی دہلی۔ انٹرنیشنل اردو فاؤنڈیشن۔ 2006

سروش۔ رفعت۔ الوداع او پندر ناتھ اشک۔ زاویۂ نظر۔ نوئیڈا، نورنگ کتاب گھر۔ 2004

احمد، رضوان۔ عصمت۔ اردو محفل (انٹرنیٹ فائل)

www.urduchannel.in

ش۔ بانو ادیب: عظیم افسانہ نگار

جب انسان اپنی مادری زبان سے پیار کرتا ہے تو اس کے دل میں اس طرح کے ارمان پیدا ہوتے ہیں کہ کیوں نہ میں اپنی زبان کو پڑھوں بھی، پھر جب وہ پڑھنے لگتا ہے تو اس کے دل میں آرزو پیدا ہوتی ہے کہ میں کچھ لکھوں بھی۔ اس کے بعد ہمتیں، حوصلے، الفاظ، وژن، مطالعہ کثیر، مقابل ادبیات ولسانیات پر دسترس اور قوت فہمی، ماحول، فرصت، لگن، بے تابی، حالات کا مشاہدہ، گوناگوں واقعات، وقت کا تقاضا اتنی ساری چیزیں جب اس میں جمع ہو جاتی ہیں تو اس کے رشحات قلم سے ایسے ایسے شاہکار نکلتے ہیں کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے۔ پھر اس کے اپنے جیسے ہی انسانوں سے اس کی عظمت کا اعتراف کیے بنا نہیں رہا جاتا۔ وہ اسے پرشکوہ اور عظیم الشان اسٹیج پر بٹھا کر اپنی محبتوں اور دعاؤں سے نوازتے ہیں اور آئندہ اس کی عظمت کا سکہ اپنے دلوں میں بٹھا لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ نہ صرف اس کی زندگی تک محدود رہتا ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی اس کی عظمت اسی طرح دلوں میں بسی رہتی ہے۔

اپنی زبان سے پیار کرنے والوں میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی ابتدا سے ہی ان

کے ہمراہ رہی ہیں نیز اس کے بعد والے مرحلے یعنی فروغ اردو ادب میں بھی صرف مردوں کے ہی کارنامے نہیں ہیں بلکہ خواتین نے بھی ان کے شانہ بشانہ اور بسا اوقات تو ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر اردو ادب کی خدمت کی ہے اور اپنے قلم سے رہتی دنیا تک کے لیے قیمتی اور لامثال و نادر کارنامے نقش کیے ہیں۔

ایسی خواتین اہل قلم کی ایک طویل فہرست ہے جن میں ایک نمایاں نام ش۔ بانو ادیب یعنی شکیلہ بانو ادیب گنگوہی کا بھی شامل ہے۔ش۔ بانو ادیب اپنے عہد کی ممتاز اور مایا ناز افسانہ نگار تھیں۔ جن کی پیدائش اتر پردیش کے ضلع سہارنپور کے مردم خیز اور گنج علوم قصبہ گنگوہ میں بابو محمد حنیف کے گھر ہوئی۔ش۔ بانو ادیب کے گھر کا ماحول علمی ادبی تھا اس لیے ان کی مناسب تعلیم و تربیت ہوئی۔ان کے والد بہت بڑے ادب شناس اور علمی مزاج رکھنے والے انسان تھے۔اسی طرح ان کے چچا اپنے علاقے کے بزرگ شاعر و استاذ تھے اور انھیں اردو، عربی فارسی اور دیگر کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔

ابتدائی دور میں ش۔ بانو ادیب نے اپنے چچا کے سامنے ہی زانوئے تلمذ تہہ کیا اور اس دور میں چند غزلیں بھی لکھیں مگر بعد میں ان کا رجحان افسانہ نگاری کی طرف مائل ہو گیا اور اس میدان میں انھوں نے اپنی شناخت بنائی بلکہ بعد میں انھیں افسانہ نگار کے عنوان سے یاد بھی کیا گیا۔

1955 سے لے کر 1980 تک ملک بھر کے تمام ادبی رسائل و اخبارات میں ش۔ بانو ادیب کے افسانے شائع ہوتے رہے اور وہ اپنے مشن کی بلند منزلوں کو چھوتی رہیں۔انھوں نے اس میدان میں کئی کامیاب تجربے بھی کیے اور دنیائے اردو ادب کو نئے اسلوب، طرز نگارش اور انداز عطا کیے۔ان رسائل و اخبارات کی فہرست طویل ہے جنھوں

www.urduchannel.in

نے ش۔ بانو ادیب کے افسانوں کو اپنے صفحات پر جگہ دی تاہم ان میں سے چند نمایاں نام یہ ہیں۔''خاتون مشرق دہلی''۔''ماہنامہ ٹیکسٹائل امرتسر''۔''جہاں نما، گنگوہ''۔''شمع خیال گنگوہ''۔''روزنامہ تیج، دہلی''وغیرہ

ش۔ بانو ادیب کا اسلوب نگارش خواتین کے بہترین لب و لہجے والا اور رومان پرور انداز لیے ہوئے ہے۔یہ ایسا اسلوب ہے جو اُس دور کے افسانہ نگاروں کے یہاں کم ہی نظر آتا ہے نیز ان کے یہاں جدیدت بھی شجر ممنوعہ نہیں ہے بلکہ اس کا خاطر خواہ اور موقع بہ موقع خوب استعمال کیا ہے۔ان کی تحریروں میں جگہ جگہ عورت کے حقوق، مردوں کی زیادتیوں کا بیان اور سماج و معاشرے میں عورت کے مقام و مرتبہ کا تعین جیسے احتجاجات شامل ہیں اور یہ مناقشات ان کے افسانوں کے خاص پہلو ہیں۔اس کے علاوہ وقت اور حالات کے بدلتے ڈھنگ، آہنگ، تقاضوں اور مطالبوں کی آواز پر بھی ش۔ بانو ادیب نے لبیک کہا ہے۔اس طرح ان کا قلم ادب کی منشا اور وقت کی چاہت کے مطابق آگے بڑھتا رہا۔ان کے انداز میں حقیقت بیانی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔کہتے ہیں کوئی بھی کہانی حقیقت سے دور رہ کر نہیں لکھی جا سکتی۔ویسے لازمی نہیں کہ کہانی حقیقت کا عین ہی ہو مگر کم سے کم غیر تو نہ ہو۔اس اصول پر ش۔ بانو ادیب کے افسانے پورے اترتے ہیں۔

ذیل میں ان کے افسانوں کے چند اقتباسات پیش ہیں جن سے ش۔ بانو ادیب کے اسلوب کا اندازہ لگا جا سکتا ہے۔

اللہ مالک ہے ــــــ

''وہ جائے نماز پر بیٹھ کر زار و قطار رو رو کر دعا مانگ رہا تھا۔اچانک پوسٹ مین نے اس کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ریاض احمد نے لپک کر دروازہ کھولا۔سامنے پوسٹ مین کھڑا تھا۔پوسٹ مین نے لاٹری میں نکلا ہو 45 ہزار روپے کا ڈرافٹ اسے دیا۔اس کی

آنکھوں میں خوشی سے امنڈا ہوا سیلاب بہنے لگا۔ ریاض احمد کو محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا سن لی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اب اسے بیٹی کی سگائی کے لیے رقم مل گئی تھی۔ اللہ نے اس کی بیٹی کی سگائی سے ایک ماہ قبل ہی یہ انتظام کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں جب کہ مخلوق اسے ضرورت میں ہی یاد کرتی ہے۔''

جیل یاترا ـــــ

''ونے کمار دوبے نے سنیل کمار کو انسانیت اور اخلاق کا درس دیا۔ اسے قانون کی دھارائیں بتائیں۔ سنیل نے سوچا اب اسے جیل جانا ہی پڑے گا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ داروغہ نے سنیل کو ڈراتے ہوئے کہا کہ تم اس جیل یاترا کو کبھی بھول نہیں پاؤ گے۔ سنیل نے اس کی جیب میں خاموشی سے کچھ گاندھی چھاپ نوٹ ڈال دیے تو داروغہ نے مصلحت بھرے انداز میں کہا۔ تم بے قصور ہو میں تمھارے خلاف مقدمہ درج نہیں کرسکتا۔ تھانے میں بیٹھے ایک شخص کو اپنے پاس بلا کر مغلظات سے نوازا۔ میں دیکھتا ہوں اب تمھیں کون بچائے گا۔ سنیل کے خلاف جو مقدمہ درج کرنا تھا، اس شخص کے نام کر دیا اور سنیل کو تھانے سے باعزت بری کر دیا۔''

چندا ماما دور کے ـــــ

''اکثر ماں اپنے بچے کو ایک ہی لوری سناتی تھی ـــــ چندا ماما دور کے پورے کھائیں بور کے۔ بچہ لوری سن کر سو جاتا تھا۔ ماں اللہ کو پیاری ہوگئیں اور بچہ جوان ہوگیا۔ بچہ کی سمجھ میں آیا کہ میری ماں کتنی سمجھ دار تھی جو مجھے بچپن سے ہی آگاہ کرتی تھی کہ ماما دور کے ہیں یہ بات میری سمجھ میں اب آئی ہے۔ اب مجھے لوری کون سنائے گا جسے میں کہہ سکوں کہ لوری سن کر سوؤں گا نہیں بلکہ بیدار رہوں گا۔''

فطرت ـــــ

''نوید اور رشید دونوں بھائیوں کا مزاج مختلف تھا۔ بچپن میں نوید مٹی کے گھروندے بناتا تھا اور رشید انھیں توڑ دیتا تھا۔ دونوں جوان ہوگئے تو یہ فرق نمایاں ہوگیا۔ آج نوید بلڈر ہوگیا اور رشید نیتا۔''

ش۔ بانو ادیب کی مذکورہ تحریروں اور آج کے عہد کی تحریروں کا موازنہ کیا جائے تو دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ملے گا۔ حالانکہ آج ندرت پیدا کی جارہی ہے۔ جدید تجربوں کے ساتھ فن کو نیا سے نیا اور آسان سے آسان تر کرنے کی کوشش ہر دن جاری ہے اور اس سمت نئے نئے ایکسپریمنٹ کیے جارہے ہیں مگر ش۔ بانو ادیب نے آج سے پچاس۔ ساٹھ سال قبل اس درد و کرب کو اپنے فن کا موضوع بنایا اور جدید مہم میں ایک پیش رو کا کردار انھوں نے ادا کیا۔

ش۔ بانو ادیب کا قلم اچانک 9/جنوری 2012 کو خاموش ہوگیا اور وہ اپنے قارئین، واقف کاروں اور چاہنے والوں کے دلوں میں ایک سوال چھوڑ کر مالک حقیقی سے جاملیں کہ ـــــ

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے....؟

www.urduchannel.in

راجندر سنگھ بیدی: تھیم کا بادشاہ

اردو کا گلشن اس اعتبار سے بہت خوش نصیب رہا ہے کہ اس میں وقت وقت پر ایسے ایسے گل پھول کھلے اور مہکے ہیں جنھوں نے اس کی زینت میں اضافہ کیا اور اسے رشک جناں بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ وہ کوئی بھی صنف ادب ہو یا کوئی بھی طرز خیال، انھوں نے وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو سنوارا اور دنیا کے سامنے پیش کیا، چنانچہ دنیا نے انھیں پہچانا اور ان کی خوشبو وخوبیوں کو اپنے گھروں، دلوں، دماغوں اور ارمانوں میں بسایا۔ گلشن اردو کے ایسے پھولوں میں اپنے عجیب و انوکھے طرز کے مالک اور 'تھیم کے بادشاہ' مشہور افسانہ نگار اور مایہ ناز ادیب و قلم کار 'راجندر سنگھ بیدی' کا بھی شمار ہوتا ہے۔ حالاں کہ چمن سے ایسے پھولوں کو رخصت ہوئے مدت گزری، مگر آج تک ان کی خوشبو باقی ہے اور دماغوں میں ان کے ذریعے عام کی گئی تروتازگی موجود ہے۔

برصغیر کے افسانہ نگاروں کی صف اول کے قلم کار بیدی کا تعلق اسی سرزمین سے ہے جس کی خاک سے اقبالؔ و فیضؔ اٹھے اور ساری دنیا پر چھا گئے، پھر بیدی کیوں اس سعادت اور سرخ روئی سے محروم رہتے، اردو دنیا اور اردو کے عاشق تمام جہانوں نے ان کی خوب

www.urduchannel.in

پذیرائی کی اور انھیں اردو ادب کا امام مانا۔ آج ان کا شمار اردو افسانہ کے عناصر اربعہ میں کیا جاتا ہے۔ منٹو، عصمت، کرشن چندر اور پھر بیدی۔

بیدی نے اپنا سب سے پہلا افسانہ ''بھولا'' لکھ کر اور پنجاب کے دیہاتوں کو اپنا موضوع بنا کر اردو ادب میں اُس طرح کو مضبوط کیا جس کی بنیاد پریم چند نے ڈالی تھی۔ لہجہ اس قدر شفاف اور دھیما کہ قاری کے دل میں ایک ایک بات اترتی چلی جائے۔ ان کی یہی خصوصیت تھی اور یہی طرۂ امتیاز جس نے آگے چل کر ان سے ''ایک چادر میلی سے'' جیسا شاہ کار اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ناولٹ لکھوایا۔ بیدی کے افسانے کا موضوع سب سے مختلف اور منفرد ہے۔ چنانچہ وہ جذباتی، نفسیاتی، معاشرتی اور سماجی گتھیوں کو الگ الگ سلجھاتے ہیں نیز کردار کی انفرادیت میں گہری جذباتیت سمو کر ایک نئے اور تیکھے انداز میں جس طرح پیش کرتے ہیں یہ بیدی کا اپنا امتیاز ہے۔ افسانے میں فلسفیانہ انداز وہ بلا ضرورت نہیں استعمال کرتے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ موضوع ہی ان کا محور ہوتا ہے، جس کے گرد اُن کے افسانے فنکارانہ انداز میں رقصاں رہتے ہیں۔

چنانچہ ان کے افسانے ''وہ بڈھا''۔ ''گرہن''۔ ''غلامی''۔ ''معاون اور میں''۔ ''ہم دوش''۔ ''وٹامن''۔ ''چھوکری کی لوٹ''۔ ''صرف ایک سگریٹ''۔ ''متھن''۔ ''تعطل''۔ ''جوگیا''۔ ''یوکلپٹس''۔ ''دیوالہ''۔ ''بکنی''۔ ''ٹرمینس سے پرے''۔ ''سونفیا''۔ ''کلیانی''۔ ''آئینے کے سامنے''۔ ''لاجونتی''۔ ''باری کا بخار''۔ ''لمبی لڑکی''۔ ''ببل''۔ ''گرم کوٹ''۔ ''پان شاپ''۔ ''تلادان''۔ ''من کی من میں''۔ ''چشم بددور''۔ ''اپنے دکھ مجھے دے دو''۔ ''جنازہ کہاں ہے''۔ ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' وغیرہ افسانوں کا، موضوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں، کوئی ربط نہیں کوئی لگاؤ نہیں ہے بلکہ سب کا مواد، ہیئت اور موضوع ایک دوسرے سے پوری طرح مختلف اور جدا ہے۔

مذکورہ بالا افسانوں میں بعض کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سید احمد قادری لکھتے ہیں:

''افسانہ ''متھن'' کے سلسلے میں لوگوں نے بیدی کو فحش افسانہ نگار قرار دیا تھا۔ حالانکہ اس میں بیدی نے ہمارے سماج کی ایک تلخ حقیقت کو افسانوی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ حقیقتاً ایک آرٹسٹ کی زندگی کے درد و کرب کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ''جنازہ کہاں ہے'' ایک شاہکار نفسیاتی افسانہ ہے اس میں مزدوروں کی غم سے نڈھال مایوس اور تھکن سے چور زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ مزدور جب اپنے کام سے لوٹتے ہیں تو ان کے چہرے پر اتنا درد و کرب اور گھٹن ہوتی ہے کہ ایک حسّاس انسان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ مزدور کسی جنازے کو سپرد خاک کرنے جا رہے ہیں۔ طوائفوں کے موضوع پر بے شمار افسانے لکھے گئے ہیں۔ لیکن بیدی نے اپنے افسانے ''کلیانی'' میں جو چیز عام روش سے ہٹ کر دکھائی ہے وہ ہے طوائفوں کی شرم و حیا اور ممتا و پیار کا جذبہ۔ ''تعطل'' میں کشمیریوں کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے جہاں خوبصورت پس منظر رکھنے کے باوجود وہاں کے لوگوں کی غربت نے انہیں بالکل نچلی سطح پر پہنچا دیا ہے۔ متوسط طبقے کی معاشی زبوں حالی اور تنگ دستی سے خاندان میں پیدا ہونے والی حسرتوں کو ''گرم کوٹ'' میں بڑی فنکاری سے بیدی نے افسانوی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں انسانی حسرتوں اور مایوسیوں کے ساتھ ساتھ امید و یاس کے بنتے مٹتے گھروندے کی حقیقی ترجمانی کی گئی ہے۔ اس افسانہ کو پڑھنے کے بعد بے اختیار مشہور روسی افسانہ ''The Coat'' یاد آتا ہے۔ ''وہ بڈھا'' بھی بیدی کے شاہکار افسانوں میں ایک ہے۔ اسے دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان کے افسانے کی صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس افسانہ میں ہر وہ احساس اُجاگر نظر آتا ہے جو آج کی زندگی کا اہم ترین حصہ ہے۔ اس میں بیدی نے واقعات کے ساتھ ساتھ وہ فنّی بالیدگی بخشی ہے کہ حقیقت کا پرتو جھلکتا ہے۔ ''اپنے دکھ مجھے دیدو'' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو دو حصّوں میں منقسم ہے۔ ایک جانب وہ بھابھی اور بہو ہے تو دوسری طرف اسے ایک بیوی کا بھی فرض نبھانا ہے۔ اس کشمکش بھری کہانی کو بڑے خوبصورت اور حسین پیرائے میں بیدی

www.urduchannel.in

نے پیش کیا ہے۔ اس افسانہ کو بیدی نے اپنی سوانح کے طور پر سامنے لایا ہے۔ ''وٹامن'' میں غربت اور افلاس سے دبی کچلی مزدور طبقے کی عورتیں، کس طرح اونچے اور بڑے طبقے کے افراد کی ہوس کا نشانہ بننے پر مجبور ہوتی ہیں انہیں بڑے فنکارانہ انداز میں روشناس کرایا ہے۔ ''ہم دوش'' میں مایوس انسان کے جذبات کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ہندو سماج میں عورت کی مظلومیت اور بے بسی کا موثر نقشہ ''گرہن'' میں نظر آتا ہے۔ ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' مذہب کے ان ٹھیکہ داروں پر بھرپور طنز ہے جو مذہب کو اپنی میراث تصور کرتے ہیں۔ اس خیال کو بڑے نفسیاتی اور فنکارانہ طور پر بیدی نے اس افسانہ میں پیش کیا ہے۔''

پدم شری اور غالب ایوارڈ یافتہ راجندر سنگھ بیدی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو افسانے کو عالمی ادب کے ہم پلہ بنایا۔ چنانچہ ڈاکٹر سید احمد قادری کا ہی قول ہے:

''بیدی نے اپنے افسانوں سے اردو افسانوی ادب کو ہی صرف مالا مال نہیں کیا بلکہ اسے اس قابل بھی بنایا کہ ہم مغرب کی ترقی یافتہ زبانوں کے افسانوں کی صف میں اردو افسانے کو رکھ سکیں۔''

آگے تحریر کرتے ہیں:

''افسانہ درحقیقت اظہار خیال کے ایک مخصوص فن کا نام ہے، اس کی تشکیل و ترتیب میں موضوع، مواد اور فکر و خیال کے ساتھ فنّی حسن کا ہونا لازمی ہے۔ اور ان سارے عناصر کو بیدی نے اپنے افسانے میں فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے۔ موضوع اور فن دونوں بیدی کی تخلیقات میں جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس امر کا اعتراف خود بیدی نے اپنے افسانوی مجموعہ گرہن کے پیش لفظ میں کیا ہے:

''مجھے تخیل فن پر یقین ہے۔ جب کوئی واقعہ مشاہدے میں آتا ہے تو میں من و عن بیان کر دینے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلکہ حقیقت اور تخیّل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اسے احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

بیدی کی اسی لافانی اور لامثال طرز نگارش نے انھیں اپنے مداحوں میں مشرق کا ''چیخوف'' بنادیا۔ چنانچہ آج اگر کہا جائے کہ بیدی کا لہجہ کس فرانسیسی ادیب سے ملتا جلتا ہے تو بے ساختہ زبان پر ان ہی کا نام آتا ہے۔

افسانوں اور کہانیوں کی تھیم بُننے میں انھیں کمال کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ جس طرح کی بھی کہانی لکھتے اسے اس انداز سے لکھتے کہ اس کے مناظر زندہ ہوجاتے تھے------ شاید اسی لیے کنہیالال کپور نے انھیں ''تھیم کا بادشاہ'' کہا ہے۔ یقیناً یہ لقب ان پر سجتا بھی ہے اور ان کے قلم سے نکلے ہوئی تمام کہانیوں اور افسانوں کے مجموعے۔ ''دانہ و دوام''۔ ''گرہن''۔ ''کوکھ جلی''۔ ''اپنے دکھ مجھے دے دو''۔ ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' اور ''مکتی بودھ'' اس حقیقت کا بیان ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی اور منٹو کے مابین فرق بیان کرتے ہوئے بی بی سی اردو کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں معروف افسانہ نگار انتظار حسین کہتے ہیں:

> ''.....ان میں تو فرق نمایاں ہے۔ ان کا کہانی لکھنے کا انداز ہی مختلف ہے۔ منٹو کے ہاں تو بہت تیز رفتاری سے کہانی چلتی ہے اور بڑے دھماکے سے ختم ہوتی ہے اور راجندر سنگھ بیدی کے ہاں آہستہ آہستہ ایک خاص انداز سے کہانی چلے گی۔ ایک خاص اپنی زبان انھوں نے بنائی۔ بمبئی کے انداز میں ایک پختگی ان میں نظر آتی ہے۔''

بیدی اصل اور حقیقت میں اردو کے قلم کار تھے مگر نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی جب انھوں نے جموں ریڈیو اسٹیشن چھوڑ کر فلمی دنیا میں داخلے کی ٹھانی اور اس سنگلاخ وادی میں اپنے قلمی جوہر دکھانے کے لیے من بنایا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ چنانچہ تقریباً 70 سے زائد فلموں کے لیے انھوں مکالمے، کہانیاں، اسکرین پلے لکھے اور خود بھی متعدد فلمیں ڈائریکٹ کیں۔ جن میں ''آنکھیں دیکھی''۔ ''مٹھی بھر چاول''۔

www.urduchannel.in

''ایک چادر میلی سی''۔ ''نواب صاحب''۔ ''دستک''۔ ''بہاروں کا سپنا''۔ ''میرے صنم''۔ ''ستیہ کام''۔ ''بمبئی کا بابو''۔ ''داغ''۔ ''مسافر''۔ ''گرم کوٹ'' وغیرہ جیسی شہرہ آفاق فلمیں شامل ہیں۔ ان فلموں کے متعلق بس اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ بالی ووڈ کا ایسا نایاب سرمایہ ہیں جن کی قیمت آسمانوں سے بھی ادا نہیں ہوسکتی۔ یہ وہی دور ہے جب ہندوستانی فلم انڈسٹری میں اردو کا سورج نصف النہار پر تھا۔ فلمی دنیا کا ہر شخص اردو بولنا، سمجھنا، لکھنا اور پڑھنا چاہتا تھا، اسی طرح سنیما بینوں میں بھی اس کا چلن عام ہوگیا تھا اور وہ ان فلموں کو راست سمجھنے کے لیے اردو سیکھتے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔

''بڑی بہن''۔ ''داغ''۔ ''مرزا غالب''۔ ''دیوداس''۔ ''ستیہ کام''۔ ''ابھیمان''۔ ''مدھومتی'' اور ''انورادھا'' کے مکالمے اپنی ادبیت اور کردار و ماحول شناسی کی بنا پر بے انتہا سراہے گئے۔ اسی طرح دستک کو اعلیٰ فنی خوبیوں کی بنا پر 1970 کا قومی ایوارڈ دیا گیا۔

مآخذو مراجع

ڈاکٹر سید احمد قادری۔ ہماری ویب (نیوز پورٹیل)۔ پاکستان

بی بی سی ڈاٹ کوم۔ طاہر سید اور انتظار حسین کی گفتگو پر مبنی۔

راجندر سنگھ بیدی کی فلمیں۔ ڈیسک رپورٹ۔ ادارہ دائرۃ المعارف بمبئی۔ 1988

✸ ✸ ✸

رشید حسن خاں: جو آبرو تھے اردو کی!

کہتے ہیں کسی بھی فن پارے کو پرکھنے کا نام تنقید اور اسے اس کے خفیہ خانے سے باہر نکال کر مدون کرنا تحقیق کہلاتا ہے۔ اردو میں اسی تحقیق کا سلسلہ آج سے تقریباً، ڈیڑھ سو سال قبل حافظ محمود خاں شیرانی کی مایاناز تصنیف ''پنجاب میں اردو'' اور ان کے دیگر جلیل القدر کارناموں سے ہوئی۔ اس کے بعد کا عالم تو یہ ہے کہ اردو دنیا اس جوہر نایاب سے واقف ہوگئی اور یکے بعد دیگرے اردو محققین اور مدونین متون کے اسمائے گرامی کا زرین سلسلہ بن گیا۔ چنانچہ مولوی عبدالحق، عزیز احمد، قاضی عبدالودود، متیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، مشفق خواجہ، مالک رام، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر وحید قریشی اور جمیل جالبی وغیرہ، پروفیسر رشید حسن خان اسی سلسلۃ الذہب کی ایک اہم کڑی بلکہ بہ وجود اس صف کے ممتاز اور نمایاں محقق تھے۔ ان کا شمار اردو کے ان ہی چوٹی کے گنے چنے محققوں میں ہوتا ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب ان کے علمی اور تحقیقی کارناموں، پوسٹ فارورڈ باتوں اور دوٹوک اعتراضات نے پوری اردو دنیا میں دھوم مچادی تھی۔ جس کے بعد اردو میں بغیر تحقیق، بغیر حوالہ اور ہوا میں بات کہنے کا چلن تھم سا گیا تھا۔ حالاں کہ یہ اردو زبان وادب

www.urduchannel.in

کے حق میں ایک مناسب، بروقت اور جائز عمل تھا مگر ابتدا میں اردو دنیا اس کا برا مان گئی۔ رشید حسن خاں کو بھی اس برا ماننے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ان کا تو ہدف ہی بس یہ تھا کہ کسی بھی طور اردو ادب میں عام غلط فہمیاں، روایات اور سینہ بہ سینہ یا نسل در نسل چلی آنے والی بے سروپا باتوں کا یا تو کوئی حوالہ مل جائے یا انھیں جہان اردو سے دیس نکالا دے دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اس کے لیے چند کڑے اور سخت اصول وضع کیے اور انھیں اپنے اس عمل کے لیے اپلائی کیا۔ یہ سلسلہ چل نکالا اور ان کی محنت و کوشش رنگ لائی۔ اردو دنیا نے انھیں عظیم محقق تسلیم کیا اور ان کی سفارشات، ہدایات اور اقوال کو خصوصی اہمیت دی۔ انھیں اعلا مقام دیا گیا۔ مسلّم اساتذہ تحقیق بھی اب ان سے ہم کلام ہونے لگے طلبائے تحقیق کے تو آئیڈیل تھے۔

رشید حسن خاں کا مختصر تعارف یوں کرایا جاسکتا ہے کہ وہ اردو زبان وادب کے نام ور محقق، نقاد، تدوین کار اور ماہر لغت واملا تھے۔ ان کی ذات میں اکابر تحقیق وتدوین کے انفرادی اور مکمل خصائص جمع تھے۔ انھوں نے اردو کلاسیکی ادب کی بعض کتابوں (باغ و بہار، فسانۂ عجائب، مثنوی سحرالبیان اور مثنوی گلزار نسیم وغیرہ) کو جس انہماک اور دیدہ ریزی سے اور مثالی طرز پر مدون کیا، اس کے پیش نظر وہ اردو تدوین کی تاریخ میں ''خاتم المدونین'' کہلانے کے مستحق ہیں۔ وہ عمر بھر جاہ طلبی، نام ونمود اور شہرت پسندی سے گریزاں رہے۔ چنانچہ تاعمر حق گوئی و بے باکی ان کی یگانۂ روز گار شخصیت کا ایک نمایاں وصف رہا۔

ان کی شہرت اور ناموری اردو دنیا اور اس سے باہر کے جہانوں میں بھی معروف ہوئی اور انھیں ہر جانب سے خطابات، تعریفیں اور پذیرائیاں حاصل ہوئیں۔

ایک مقام پر عارف نوشاہی رشید حسن خاں کی اسی شان کے متعلق رقم طراز ہیں:

''اردو زبان کے نامور محقق، کلاسیک اردو متون کے مرتب (جن میں باغ و بہار،

مثنوی گلزار نسیم، انتخاب ناسخ، انتخاب سودا، انتخاب نظیر اکبر آبادی، انتخاب شبلی، انتخاب مراثی انیس و دبیر، دیوان خواج میر درد، مثنویات شوق لکھنوی وغیرہ شامل ہیں) رشید حسن خاں (دسمبر 1925-26 فروری 2006-شاہ جہاں پور) سے کون واقف نہیں؟ جسے بھی اردو تحقیق سے کچھ علاقہ ہے وہ ان کے نام سے آگاہ اور ان کی خدمات کا مداح اور معترف ہے۔ اصول تحقیق اور طریقۂ املا میں وہ خاص نظریات کے حامل تھے اور ان ہی نظریات کے تحت انھوں نے اپنا تحقیقی اور تدوینی کام پیش کیا۔ (جسے خوب سراہا گیا)''

ایک عارف نوشاہی، ہی نہیں بلکہ ہر وہ شخص رشید حسن خاں کی ان عظیم الشان خوبیوں کا ذکر کرے گا اور ان کے طریقہ تحقیق اور اس کے بعد اردو میں آئی صفائی و رعنائی کا اعتراف تو وہ بلا تامل کرے گا۔ اس کے علاوہ ان کی شان تدوین اور متون کی مناسب و دلوں کو چھونے جانی والی تدوین کا منکر کوئی بھی نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ گیان چند جین جیسے 'آئیکن تحقیق' بھی انھیں 'خدائے تدوین' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور ان کے تدوینی کارناموں کو 'صحیفہ' کہتے ہیں۔ یہ شاید اظہار ہے یا اقرار حق، وہی جانیں، مگر ایک بات تو طے ہے کہ رشید حسن خاں کسی معمولی شخصیت یا ذات کا نام نہیں بلکہ ادراک سے بہت آگے کی ہستی کا نام ہے۔

شاہجہاں پور کے اپنے ابتدائی قیام ایام سے لے کر دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی زینت بننے اور گائرہال ہاسٹل تک ان کے کارنامے، علم و تحقیق کے میدان کے وہ جواہر ہیں جن کے دم سے اردو دنیا تاباں ہے اور دیگر معاصر زبانوں کو بھی روشنی تقسیم کر رہی ہے۔

رشید حسن خاں نے تحقیق کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے (انھیں اردو دنیا تبصروں کے عنوان سے جانتی ہے) ان کی چند جھلکیاں پروفیسر گیان چند جین اس طرح دکھاتے ہیں: (الفاظ اور جملوں کی ترتیب میں ناگزیر مناسب اور جزوی تبدیلی کے ساتھ)

''.....معیاری سیریز میں انتخاب ناسخ کے طویل مقدمے پر میں نے تبصرہ کیا تھا، جو

www.urduchannel.in

پہلے کتاب نما میں شائع ہوا.....اس مقدمے کے کی پہلو قابل ذکر ہیں۔ جن میں اہم ترین یہ ہے کہ خاں صاحب نے اس (عام) غلط فہمی کا ازالہ کیا کہ ناسخ نے اصلاح زبان کے ضابطے بنائے تھے۔ انھوں نے کئی اقتباسات سے ثابت کیا کہ یہ ضابطے ناسخ کے بعد ان کے شاگردوں نے بنائے تھے۔

دیوان غالب صدی ایڈیشن کے مرتب مالک رام ہیں۔ اس پر خاں صاحب کا تبصرہ پہلے رسالہ 'تحریک' دہلی کے غالب نمبر 1969 میں شائع ہوا.....خان صاحب نے تبصرہ بڑی دیدہ ریزی اور عمق نظر سے لکھا ہے۔ (اس میں بقول اطہر فاروقی: رشید حسن خاں صاحب نے اس پر طویل تبصرہ کر کے یہ ثابت کیا کہ اس میں بہت سے اشعار کا متن ہی درست نہیں (چنانچہ) اس تبصرے کے بعد ادبی حلقوں میں اس دیوان کی قدر و قیمت صفر ہو گئی)

ایک اور تبصرہ ڈاکٹر زور کی مرتبہ 'اردو شاعری کا انتخاب' پر ہے۔.....خاں صاحب نے اس میں تحریف متن کے جو نمونے دیے اور انتخاب میں عدم توازن کی نشان دہی کی، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کام ڈاکٹر زور نے خود نہیں کیا بلکہ کسی شاگرد سے کرایا ہے۔

اسی طرح شہرت یافتہ تبصرہ 'علی گڑھ تاریخ ادب اردو' پر ہے۔ رشید حسن خاں نے اس تاریخ کی خامیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مشہور ہے کہ ان کے تبصرے کے بعد کتاب بازار سے واپس لے لی گئی۔

اسی طرح کے چند احوال اطہر فاروقی نے بھی لکھے ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے:

''ترقی اردو بورڈ پاکستان کا سرکاری ادارہ تھا، جس میں برسوں سے اردو کا مکمل لغت مرتب کیا جا رہا تھا جس کے لیے بہت بڑی تعداد میں اسٹاف برسر پیکار تھا۔ جب اس لغت کی پہلی جلد شائع ہوئی تو رشید حسن خاں صاحب نے اس پر بھی طویل تبصرہ کیا اور بتایا کہ اس لغت کے اکثر مندرجات غلط ہیں۔ اس تبصرے نے بہت شہرت حاصل کی اور لغت کے اڈیٹر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔''

صحت الفاظ اور املا بھی رشید حسن خاں کا خصوصی میدان تھا جس کا گہرا تعلق تحقیق اور

تلاش حق سے ہے۔ چنانچہ اس میدان کے وہ ماہر اور قابل قدر اسٹار بن کر برسوں اپنا لوہا منواتے رہے اور اردو کی باطل روایتوں کو نیز نازیبا تلفظ کی (لکھنے، بولنے اور پڑھنے تمام حد تک) اصلاح کرتے رہے۔ چنانچہ ان کی مرتبہ کردہ کتاب 'اردو املا' صحت زبان و بیان کے باب میں ایک عظیم ترین کارنامہ اور لافانی سوغات ہے۔ اس کتاب کو مجلس ترقی ادب 2O۔کلب روڈ، لاہور (پاکستان) نے 720 صفحات کی ضخیم جلد میں مئی 2007 میں شائع کیا ہے۔ اس سے قبل ہندوستان سے اسی طرح کے دو ضخیم ایڈیشنز میں اس کی اشاعت عمل میں آچکی ہے۔ دنیا نے آپ کی سفارشات اور تجویزات کو کس طرح تسلیم کیا، اس کا ایک قصہ اطہر فاروقی لکھتے ہیں:

> ''صحت املا کے سلسلے میں رشید صاحب کی اکثر تجویزوں کو قبول کیا جا چکا ہے۔ اردو املا کے ہمہ گیر اثرات کا ایک ثبوت پاکستان اردو لغت بورڈ کا ضخیم لغت ہے (جس کی اب تک پندرہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں) اس میں اردو املا کی تجویزوں کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔''

یہ ذکر ان ہی رشید حسن خاں کا ہے۔ جنھیں اردو دنیا تقریباً اب بھلا چکی ہے تاہم ان کے کارنامے ناقابل فراموش اور عظیم یادگار ہیں اور اس کے باوجود آج بھی ان کے نام پر اردو، جہان اردو، جہان اردو کے باشندوں، اقلیم اردو اور اس کی رعایا کو فخر حاصل ہے۔ چنانچہ آج وہ شان بے نیازی سے عالمی زبانوں کے شعبۂ تحقیق و تدوین، صحت تلفظ و املا کی تحریکات اور کچھ حد تک تنقید کے مقابل رشید حسن خاں کا نام لیتے ہیں اور داد وصول کرتے ہیں۔

علم تحقیق اور اصول تحقیق میں رشید حسن خاں، اپنی شہرہ آفاق کتاب ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ'' کے بعد تو ایک Ikon کی حیثیت اختیار کر گئے۔ حالاں کہ آپ نے وہی طرز اپنایا جو قاضی عبدالودود کا تھا، یعنی بہ ظاہر سخت گیری اور الفاظ کی سخت، روایت، اقوال، تلفظ، املا، بیان، تعبیر، لسانی مباحث وغیرہ کے پرکھنے کی سخت کسوٹی، جس کے چکلے پر آکر ان کے پسینے

www.urduchannel.in

ضرور چھوٹتے ہوں گے اور روح فنا ہوتی ہوگی مگر بہ حقیقت یہ وہ بڑی ذمے داری اور فرض ادا کر رہے تھے۔ ماقبل مذکورہ پروفیسر گیان چند جین اور ڈاکٹر اطہر فاروقی کی بیان کردہ مثالوں اور واقعات سے یہ حقیقت بیاں ہوتی ہے اور طالب علم، اردو شائق و فروغ اردو کے لیے کوشاں تحریکات کے ذہن و فکر سے گنجلک واقعات، روایات، من گھڑت باتیں اور حقیقتیں آئینے کی طرح صاف ہو جاتی ہیں۔ یہی تحقیق کا اعلا ترین مقصد ہوتا ہے اور یہی اس سے چاہا بھی جاتا ہے۔ نیز اگر چند لفظوں میں کہا جائے کہ تحقیق کیا اور کیوں ہے تو بس یہی کہ ''احقاق حق اور ابطال باطل'' اس کا مقصد اور اس کی وجہ جواز ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنی تحریروں اور کوششوں سے اسی کو پیش کیا۔ چنانچہ اردو کے لیے ان کی مجموعی خدمات کے صلے میں انھیں ''آبروئے اردو'' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

مآخذو مراجع:

رشید حسن خاں۔ کچھ یادیں کچھ جائزے مرتبین: ڈاکٹر محمد آفتاب اشرف، جاوید رحمانی۔ نئی دہلی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ 2008

ماہنامہ، کتاب نما۔ نئی دہلی۔ رشید حسن خاں نمبر۔ مرتبہ اطہر فاروقی۔ جولائی 2002

رشید حسن خاں اور ادبی تحقیق۔ مرتبہ ڈاکٹر عبدالحمید۔ دہلی۔ کتابی دنیا۔ 2016

رشید حسن خاں۔ مرتبہ مرزا خلیل بیگ۔ لاہور۔ اکادمی ادبیات۔ 2015

ہفت روزہ ہماری زبان۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی۔ 2006

✸ ✸ ✸

پروفیسر قمر رئیس:

عمومیت سے خصوصیت تک

اس دنیا میں یوں تو ہر کوئی کسی نہ کسی مقصد کو لے کر آتا ہے مگر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خود اپنی زیست کا مقصد منتخب کر لیتے ہیں۔اس طرح سے گویا وہ اپنے مقصد حیات کو حق بہ حق پورا کرتے ہیں جس سے دنیائے دوں فیضیاب ہوتی ہے۔اردو دنیا میں ایسے بے شمار، نام ور و گم نام، نام گرامی، سلامی حیثیت کے افراد پیدا ہوئے۔جن میں سے اکثریت ان کی ہے جن کے پھیلائے ہوئے اجالوں سے آج تک اردو دنیا روشن ہیں۔ان کا مقصد الف سے یا تک، جاگنے سے سونے تک، سفر سے حضر تک، رخصت سے واپسی تک اور آمد سے رخصت تک یہی تھا کہ کسی بھی طرح سے اردو، تہذیب اردو، ہمارا مشرقی کلچر، ہماری ثقافت ہمارا تمدن باقی رہے اور دنیا اس کے وجود کا احساس کرتی رہے۔بت کدۂ السنہ میں وہ یہ اذان دیتے رہے اور دنیا کو خبردار کرتے رہے کہ ہم ایک ایسی زبان، تہذیب، روایت اور حقیقت کے پاسبان ،نقیب، رسول اور امین ہیں جو زندگی کا سبق دیتی ہے بلکہ مردہ تن بدن میں حیات کی لہریں دوڑا دیتی ہے۔اس کے لیے انھوں نے رات دن ایک کر دیا اور اپنا آرام وعیش تج دیا۔

www.urduchannel.in

ڈاکٹر، پروفیسر قمر رئیس شاہ جہاں پوری، ایسے ہی افراد میں سے تھے جن میں فروغ اردو کا جذبہ اور کوشش، جہات وامکانات اس قدر بسے ہوئے تھے کہ ان کے دیکھنے والے، ان سے ملنے والے اور اردو کے تئیں ان کے درد سے واقف کار انھیں موجودہ عہد کا بابائے اردو کہتے تھے۔

پروفیسر قمر رئیس کا اصل نام مصاحب علی خاں تھا۔آپ 12 جولائی 1932 کو شاہ جہاں پور (یوپی) میں مولوی عبدالعلی خاں کے گھر پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم شاہ جہاں پور میں حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ، آگرہ اور دیگر علمی مقام کی سیر کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے خاندانی پیشے 'وکالت' سے وابستہ ہوئے مگر حسب روایت اس سے بہت جلد کنارہ کش ہو کر اکیڈمک لائن میں آ گئے۔چنانچہ بحیثیت ریڈر ان کا تقرر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ہوا جہاں وہ ترقی کرتے کرتے پروفیسر اور دو مرتبہ صدر شعبۂ اردو، رہ کر ریٹائرڈ ہوئے۔اس کے بعد وہیں وہ وزیٹنگ پروفیسر بھی بنے۔علاوہ ازیں بعد تقریباً تین مرتبہ اردو اکادمی دہلی کی وائس چیئر مین شپ کے فرائض بھی آپ نے انجام دیے۔نیز پروفیسر قمر رئیس تاشقند میں پانچ سال تک انڈین کلچرل سینٹر کے ڈائرکٹر بھی رہے۔وہ پانچ بار انجمن اساتذہ اردو جامعات کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔انہوں نے 18 سال تک انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔وہ اردو کے پہلے پروفیسر تھے جنہیں یو جی سی نے نیشنل لیکچرار کے اعزاز سے نوازا تھا۔اس کے علاوہ 2001 میں تاشقند یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری تفویض کی تھی۔

ان کا علم وحلم، اردو کی ترویج واشاعت کے لیے فکرمندی اور مناسب اقدام نے انھیں دنیا بھر میں معروف شخصیت بنا دیا۔بہت کم عرصے میں وہ عمومیت کے زمرے سے نکل کر

خصوصیت کی صف میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ وہ دہلی یونیورسٹی سے سبک دوشی کے بعد انھیں دنیا بھر کی متعدد یونیورسٹیوں نے مہمان خصوصی، وزیٹنگ پروفیسر، اعزازی پروفیسر جیسے باوقار عہدوں کے لیے منتخب کیا۔

تدریسی مشاغل اور فروغ اردو کی اجتماعی کوششوں کے علاوہ انھوں نے انفرادی طور پر بھی نظمیں، غزلیں، افسانے، مضامین، سمپوزیم، قراردادیں، سوونیئرس، مختصر کتابچے، بہت کچھ لکھا۔ نیز آخر تک لکھتے رہے، یہاں تک کہ ان کا وقت موعود آ پہنچا۔

وہ اردو دنیا میں ایک بہترین ادیب، ممتاز ناقد، اچھے مترجم، خوش بیان شاعر، صحت مند غزل گو، حکمت و عمل سے بھرپور استاذ، طلبا سے شفقت کرنے والے بہترین مربی اور نہ جانے کن کن صفات کے مالک تھے۔ یہ تاثرات ان کے ہیں جنھوں نے ان کو قریب سے دیکھا ہے۔ چنانچہ آج تک اس ضیائے علمی اور شمع زیبا کی کرنیں تنویر فشاں ہیں۔

وہ 29 اپریل 2009 کا دن تھا جب زمین اتنے بڑے سورج کو کھا گئی جس کی الگ ہی کہکشاں تھی اور ایک وقت تو وہ تھا جب وہ سورج اور زمین دونوں پر بھاری تھے۔ مجھے ان کی ذاتی زندگی سے کوئی سروکار نہیں کہ انھوں نے کتنوں کو بگاڑا اور کتنوں کی دنیا آباد کی۔ کسے دھوکا دیا اور کس نے گلے سے لگایا۔ کون ان کا چہیتا تھا اور کس سے وہ بے رخی برتتے تھے۔ مجھے تو صرف اور ان کی اردو نوازی سے سروکار ہے جس کے لیے حالاں کہ انھیں انعامات و اعزازات بھی ملے مگر اس سے اہم وہ داعیہ ہے جس نے انھیں اس کے لیے ابھارا۔

وہ ترقی پسند ادیبوں میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے اور کم و بیش دو درجن کتب کے مصنف بھی تھے۔ ان کا بنیادی کام پریم چند پر تھا۔ وہ تین سال دہلی اردو اکیڈمی کے وائس چیئر مین بھی رہے تھے۔ انہوں نے نہ صرف ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے بلکہ اردو کے خادم کی حیثیت سے بھی کافی نام کمایا۔

www.urduchannel.in

قمر رئیس کی زندگی زاہد خشک کی مانند نہیں گزری بلکہ انھوں نے ہر طرح کی زندگی جی تھی۔ سیاسی، سماجی، علمی، فکری، معرکی۔ وہ عرصے تک کمیونسٹ پارٹی کے رجسٹرڈ ممبر رہے اور ایسے وقت میں بھی جب پارٹی حکومت ہند کی آنکھ کا کانٹا بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک مقام پر ان ہی حالات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم (علی کریم) اپنے ایک مضمون میں قمر رئیس کے کالج کے ابتدائی ایام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دراصل یہی وہ زمانہ ہے جب قمر رئیس کے سیاسی شعور کا آغاز ہوا۔ شاہ جہاں پور میں کمیونسٹ پارٹی کا صدر دفتر واقع تھا۔ جس کے سکریٹری شوکت علی خان تھے۔ وہ وہاں کی ایک سرکاری مل میں کام کرتے تھے، انھیں مل میں ہونے والی ہڑتال کی پاداش میں سبک دوش کر دیا گیا۔ قمر رئیس کی ان سے ملاقات ہوئی، اس کے بعد انھوں نے اشتراکی ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ پارٹی کے دوسرے کارکنوں سے بھی تعلقات پیدا ہوئے۔ ان میں سے بیشتر لوگ 50-1949 میں گرفتار کر کے قید کر لیے گئے کیوں کہ پارٹی میں انتہا پسندانہ پالیسی کا دور تھا۔ بی ٹی رَندیوے پارٹی کے سکریٹری تھے۔ ان کی قیادت میں پارٹی نے آزادی کو فریب قرار دیا اور کانگریس کی حکومت اور سرمایہ دارانہ نظام سے ہندوستانی عوام کو آزاد کرانے کے لیے مسلح بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس دارو گیر کی فضا سے ہراساں ہونے کے بجائے قمر رئیس پارٹی کے نزدیک آتے گئے۔ اسٹوڈینٹ فیڈریشن آف انڈیا SFI کی سرگرمیوں میں بھی شامل ہو گئے اور پارٹی کے روپوش رہ نماؤں اور کارکنوں سے مستقل ربط قائم کیے رہے۔'

اردو دنیا میں قمر رئیس کی شناخت پریم چند شناسی سے ہوئی۔ انھوں نے پریم چند کی افسانہ نگاری اور ان حالات کا گہرا مطالعہ کیا اور پیش کیا جن کے پس منظر میں انھوں نے 'سوز وطن' اور 'اسرار معابد' جیسا افسانوی مجموعہ اور ناول ترتیب دیا تھا اور وہ افسانے جو پریم پچیسی، پریم بتیسی جیسے مجموعوں میں مندرج ہیں۔ معروف افسانہ نگار رتن سنگھ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔

''پریم چند پر ان کے کام کو اردو والوں نے تو ایک اہم کام قرار دیا ہی، ہندی جگت نے بھی اس کی اہمیت کو پہچانا اور سراہا۔'

اسی بات کو مظہر امام اس طرح کہتے ہیں:

'قمر رئیس اردو دنیا میں دراصل اپنی پریم چند شناسی کے باعث پہچانے گئے۔ پریم چند سے تعلق خاطر بہتوں کو رہا ہے، پریم چند پر ایک باقاعدہ کتاب ہنس راج رہبر نے 1951 کے آس پاس شائع کرائی تھی۔ لیکن قمر رئیس کا تحقیقی مقالہ 1959 میں منظر عام پر آیا تو ان کی پریم چند شناسی مسلّم ہوگئی۔ یہ پریم چند کے ناولوں کا نہایت تفصیلی جائزہ تھا۔ اس کی مقبولیت کا عالم یہ رہا کہ اب تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پریم چند کے متعلق ان کی اور کتابیں بھی ہیں۔ انھوں نے پریم چند کے مضامین کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا اور پریم چند پر لکھے ہوئے مختلف مضامین نگاروں کا ایک انتخاب 'منشی پریم چند شخصیت اور کارنامے' کے نام سے شائع کرایا.....!'

یہ بات کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ پروفیسر قمر رئیس نے پریم چند کو امر کر دیا۔ ان کے فن پاروں پر تنقیدی، تجزیاتی، محرکاتی، تفصیلی اور گہری نظر ڈال کر ان حقائق کو اجاگر کیا جو عام طور پر اردو دنیا سے مخفی تھے۔ بلکہ بعض وجوہات کے سبب ان تک رسائی ناممکن تھی۔ مگر آپ نے وہ کام انتہائی مشقت اور خوش اسلوبی سے کر کے اردو دنیا کی ان رکاوٹوں کو صاف کر کے پریم چند شناسی کی راہ ہموار کر دی۔ چند مقامات پر وہ غچہ بھی کھا گئے اپنی پریم چند شناسی کے زعم میں کچھ باتیں ایسی بھی لکھتے چلے گئے جن کی گرفت عام طلبا اور اساتذہ نے بھی کی۔ مگر یہ ان کی اعلا ظرفی تھی کہ اس خطا کو بسر و چشم قبول کیا۔ ذیل میں اس طرح کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قمر رئیس بھی خطا و نسیان کے ازلی کلیے سے محفوظ نہ رہ سکے جن کا نام ہی کافی تھا۔

www.urduchannel.in

پہلی مثال:

پروفیسر سید محمد عقیل رضوی لکھتے ہیں:

'قمر رئیس نے اپنی کتاب 'تلاش و توازن'' میں ص:122 پر لکھا ہے کہ 'ہم خرمہ ہم ثواب' اور 'کشنا' کو پریم چند نظر ثانی کے بعد 'بیوہ' اور 'غبن' کے نام سے شائع کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ تلاش و تحقیق یقیناً اہم ہے مگر 'پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، بحیثیت ناول نگار' میں ناول 'غبن' اور 'بیوہ' پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے کہیں نہ اس کا اشارہ کیا نہ ہی اس کی وضاحت پیش کی۔ اگر 'غبن' کشنا کا بدلا ہوا نام ہے تو اس میں ایک تقابلی صورت بھی ہونی چاہیے تھی۔ پھر جب 'کشنا' ابھی تک کسی کو ملی نہیں تو یہ بات کیسے انھوں نے مان لی۔ اگر پریم چند نے اپنے کسی خط میں اس کا تذکرہ کیا ہے تو اس کا حوالہ ہونا چاہیے تھا۔ امرت رائے نے بھی یہ بات نہیں لکھی۔ کیوں کہ 'کشنا' انھیں بھی نہیں ملی۔

دوسری مثال:

اسی 'تلاش و توازن' کے ص:109 میں مندرج ایک غلطی کا ذکر ہے: قمر رئیس لکھتے ہیں:

''میرے خیال ہے کہ 'العصر' میں 1919 تک 'پلشم' کے فرضی نام سے جو کہانیاں شائع ہوئی ہیں وہ پریم چند ہی کے ذہن کی تخلیق ہیں۔ اگر چہ کوئی خارجی ثبوت اس ضمن میں تو دستیاب نہیں ہو سکا لیکن ان کہانیوں کے موضوعات، ان کا انداز تحریر اور فنی اسلوب پریم چند کی اس دور کی کہانیوں سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔

مگر 'پلشم' پریم چند کا فرضی نام نہیں ہے جیسا کہ قمر رئیس صاحب کا خیال ہے بلکہ یہ نام 'العصر' رسالے کے ایڈیٹر کے نام کے حروف کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ پ سے پیارے، ل سے لال، ش سے شاکر، م سے میرٹھی۔ اس طرح 'پلشم' پیارے لال شاکر میرٹھی ہوا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ پریم چند ہی پیارے لال شاکر میرٹھی کو کہانیاں لکھ کر دیتے رہے ہوں تو یہ کہانیاں پریم چند کی ہو سکتی ہیں۔''

یہ دو مثالیں اس لیے بھی پیش کرنا ضروری تھا کہیں قمر رئیس اور ان کے فکر وفن کو کسی دشمن کی نظر نہ لگ جائے۔ ورنہ ان کا کام اور فن، کار اور کارنامے تو سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

یہ بہت عجیب سی بات ہے کہ جب اردو ادب کی سب سے بڑی تحریک' جسے انجمن ترقی پسند تحریک' اور 'انجمن ترقی پسند مصنفین' کے نام سے تاریخ میں جانا گیا۔ جن دنوں اپنے ارتقا پر بلکہ زریں عہد سے گزر رہی تھی، اس وقت پروفیسر قمر رئیس علمی مراحل طے کر رہے تھے تاہم پھر بھی وہ ترقی پسندوں میں نمایاں مقام اور حیثیت کے حامل ٹھیرے۔ شاید مبداء فیاض نے انھیں نہایت کم عمری میں ہی وہ صلاحتیں ودیعت کیں تھیں کہ وہ بہت جلد اس مقام پر پہنچ گئے۔ آج عالم یہ ہے کہ بعد والے انھیں ترقی پسند تحریک کا ممتاز ناقد گردانتے ہیں۔

یہ رتبہ بلند ملا، جس کو مل گیا

یہ سچ ہے کہ ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند تنقید کو قمر رئیس کے وجود سے ایک وقار اور معیار حاصل ہوا۔ اور اگر ترقی پسند تحریک اس پر فخر بھی جتائے تو حق بجانب ہے اور اردو دنیا کو اس کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اس نے ایک عظیم الشان شخصیت دی جس نے اردو کا نہ صرف پیرہن بلکہ قد بھی اونچا کر دیا۔

ہمارے اکثر نقادوں نے غزل، نظم اور دیگر اصناف شاعری کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔ اس صنف کی زلفیں سنوارنے میں انھوں نے وقت صرف کیا مگر قمر رئیس نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی راہ الگ بنائی اور فکشن کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔ چنانچہ اس کے لیے انھوں نے بہترین فکشن نگار پریم چند کو اپنایا اور ان کے فن کا حق بھی ادا کر دیا۔ ''پریم چندیات''۔ ''اردو ناول کا تشکیلی دور''۔ ''جدید اردو ناول''۔ ''جدید اردو ناول میں اظہار و

www.urduchannel.in

اسلوب کے تجربے'' اور ''ترقی پسند تحریک اور اردو ناول'' یہ تمام ان کی فکشن تنقید کے مظاہر ہیں۔ چنانچہ عالم یہ ہے کہ ان کتابوں کے مطالعے سے اردو نثر کی اس اہم صنف یعنی فکشن کی تمام تنقیدی تاریخ ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

پروفیسر قمر رئیس نے اپنے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ''نیا سفر'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جسے بعد میں کتابی سلسلے کی شکل دے دی گئی۔ اس سلسلے کو بھی انھوں نے جدید ادبی مسائل، احوال وحقائق اور معاصر ادب کے تعارف وتنقید کے لیے وقف کر دیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے کا ساتواں نمبر تو ''ہم عصر اردو ناول'' کے عنوان سے ہی منظر عام پر آیا اور پروفیسر قمر رئیس کی فکشن نوازی وتنقید کی جوت اردو دنیا کے دلوں میں جگاتا چلا گیا۔ اس کے علاوہ ''اردو افسانے میں انگارے کی روایت'' اور ''افسانے کی نصف صدی'' یہ دو تاریخی نوعیت کی وہ کتابیں ہیں جو فکشن تنقید پر ان کی مکمل دسترس کی غماز ہیں۔

پروفیسر قمر رئیس تنقید کے میدان میں مارکسی نظریے کو لے کر وارد ہوئے۔ انھوں نے جہاں اس میں نئے اضافے کیے اور مارکسی نظریے کی تبلیغ کی، وہیں اس دبستان کے ارکان کو بھی بیش بہا وسعت دی۔ وہ مارکسزم کے دلدادہ اور خوشہ چیں تھے۔ انھوں نے مارکسزم سے کیا سیکھا اور وہ اس نظریہ کو بالخصوص ادبی دنیا کے لیے کتنا اہم اور ضروری سمجھتے تھے نیز یہی نظریہ کیوں نجات کا باعث بن سکتا ہے، اس کے متعلق خود ان کا بیان ملاحظہ کیجیے۔ وہ اپنی کتاب 'تعبیر وتحلیل' میں لکھتے ہیں:

> ''میں اپنے ادبی موقف اور تنقیدی تفہیم میں مارکسزم سے روشنی حاصل کرتا رہا ہوں۔ مارکسزم میرے نزدیک کوئی عقیدۂ بے لچک یا بے لچک میکانکی نظریہ نہیں بلکہ زندگی، تاریخ، معاشرہ اور انسانی کلچر کے مظاہر کی تفہیم وتعبیر کا ایک کشادہ سائنسی طریق کار ہے۔ جسے کم و بیش گزشتہ سو سال کے عرصے میں ادب کے محرکات۔ مآخذوں اور ادبی سرمایے کی تفہیم و

تجزیے میں مؤثر اور کارگر طور پر لیا گیا ہے.....''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس نظریے کے کتنے بڑے وکیل بلکہ بیرسٹر تھے۔اس نظریے کے مخالفین کے لیے ان کے تیور سخت اور کڑے تھے۔ وہ اسی نظریے کو لے کر جیتے اور مرتے رہے اور ساری عمر اس کے بینر تلے وہ ادب اور ادب پاروں کو پرکھتے و جانچتے رہے۔ بلکہ ایک وقت تو وہ آیا جب انھیں مارکسزم کا سب سے بڑا نقیب کہا جاتا تھا۔

قمر رئیس کا شعری جہان بھی وسیع کینوس پر مبنی ہے بلکہ اس کے نکات و جہات تو سب سے الگ، سب سے جدا ہیں۔ان کی شاعری گہرے مطالعے اور مسلسل مشق کا پتا دیتی ہے۔ایک ایک شعر ایسا لگتا ہے جیسے چھلنی میں چھن کر آیا ہے۔ان کی شاعری کا تعارف کراتے ہوئے اسدرضا کہتے ہیں:

''پروفیسر قمر رئیس کی شہرت اگر چہ ایک ترقی پسند دانشور، ناقد اور محقق کے طور پر ہی زیادہ ہے لیکن اس حقیقت کی بھی تردید نہیں کی جاسکتی کہ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ بالخصوص ان کی نظمیں مثلاً 'عبادت' وغیرہ ادبی دنیا میں بحث کا موضوع بنیں۔قمر رئیس مرحوم، لیک سے ہٹ کر شاعری کرتے تھے۔ان کی نظموں کے موضوعات میں تنوع اور فکر کی گہرائی ہوتی تھی۔ان کی شاعری ملک و بیرون ملک کے مؤقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتی تھیں مگر انھوں نے کبھی اپنی شاعری کو پیشہ نہیں بنایا۔عموماً فرمایش کے باوجود وہ مشاعروں میں اپنا کلام پیش کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ان کا ایک شعری مجموعہ 'شام نوروز' کے نام سے 2005 میں شائع ہوا تھا جس پر ہندو پاک کے مؤقر جرائد میں تبصرے شائع ہوئے تھے۔''

''عبادت'' کے علاوہ ان کی اہم اور معرکتہ الآرا نظم ''ماں'' ہے....جس کا لفظ لفظ دل ریز اور ''ماں'' کی عظمت و اہمیت کا بیان ہے۔مثلاً:

www.urduchannel.in

'فردوس نشیں، اے عرش مکاں!
ایثار و وفا کی کا ہکشاں
تو باغ ارم کی کھڑکی سے
اک پل کو جھانک کے بتلا دے
اپنے تن کے گہوارے میں
اس بھید بھرے اندھیارے میں
تو نے مجھ کو چلتے پھرتے
کیسے اک صورت بخشی تھی
اپنی اچھاؤ کوکھ میں
میری اس مورت کو ڈھالا تھا.....

اس طرح سے طویل سلسلے تک یہ نظم چلی گئی جس میں دنیا کی اس عظیم دولت، نعمت اور سب کچھ بلکہ وجہ کائنات ''ماں'' کے متعلق حروف و نقوش ثبت کیے ہیں۔''سراب دشت امکاں''۔''مشورہ''۔''اپنا پوٹریٹ''۔''ہم سے کیا ہو سکا''۔''مسودہ''۔''فلسطینی فدائین''۔ ''چھلاوا'' وغیرہ ان کی اور بہترین نظمیں ہیں جن کا صحیح تاثر ان کے پڑھنے سے ہی ممکن ہے۔

نظموں کے علاوہ انھوں نے غزل کی کہکشاں بھی سجائی ہے اور 'شام نوروز' ان کا مجموعہ ہے۔جس میں فکر انگیز غزلیں اور پر معنا افکار شعری پیرائے میں شامل ہیں۔

پروفیسر قمر رئیس کا سفر زندگی عمومیت سے خصوصیت تک ایک ایسے انداز اور نہج سے گزرا کہ جیسے کوئی گل افشاں راستے میں پھول بکھیرتی چلی جاتی ہے۔یا کوئی خوشبو کو جھونکا شاہراہوں کو مہکا جاتا ہے۔ان کی علمی و ادبی خدمات، ان کی جدوجہد، ان کے کارنامے، ان

کی تدریس، ان کی تنظیم، دنیا بھر سے ان کی پذیرائی یہ سب وہ تمغے اعزازات اور شواہد ہیں جو انھیں افق اردو کا خورشید و قمر بنا کر رکھیں گے۔ آخر میں ان کے لیے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ 'علم کے رئیس اور ادب کے قمر' تھے۔ جس کی ضیا سے آج تک شبستان اردو میں روشنی ہے۔

مآخذو مراجع

ایوان اردو۔ اردو اکادمی، دہلی۔ (قمر رئیس نمبر) ستمبر 2009
قمر رئیس۔ پروفیسر۔ تعبیر و تحلیل۔، دہلی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ 1996

* * *

www.urduchannel.in

ابن صفی کہتے ہیں...

حضرت اسرار احمد اسرآرناروی کی ترجمانی

لاکھوں نے پڑھا ہے چھپ چھپ کر، کتنوں نے جپا ہے نام مرا
غمگین فسردہ ہونٹوں پر، لانا تھا تبسم کام مرا
قانون کی بالا دستی کا، تا عمر رہا میں دیوانہ
مجرم کو ملے نہ جائے اماں، ہر جا تھا یہی اعلام مرا
یہ مجھ کو بتائے کوئی کہ، عنوان یہ میں نے چھیڑا نہیں
ہر مسئلہ حیاتِ عالم کا، لکھنا ہی تھا صبح و شام مرا
پھر بھی نہ مجھے گردانا گیا، پھر بھی نہ مجھے پہچانا گیا
میں کس سے کہوں اور کیا میں کہوں، کس پہ بھی نہیں الزام مرا
کس کس کا کہوں خود اپنوں نے، تا عمر نہ سمجھا کچھ بھی مجھے

سب ہی نے افادہ مجھ سے کیا، تھا فیض سبھی کو عام مرا
مرا مالک رازق اللہ ہے، میں اس کی حکومت کا قائل
ہر ازم سے بالا و اعلا ہے، یہ دین مرا اسلام مرا
مجنوں و عبادت ہی کیوں، سب ناقد مجھ کو پڑھتے تھے
ہر گام پہ چرچا تھا میرا، قاری تھا خاص و عام مرا
کردار مرے ہیں سب زندہ، زندوں کی دنیا بسائی ہے
عمران، فریدی، قاسم کیا، ہر نامی و گمنام مرا
مجرم بھی مرے اپنے ہی تھے، ان کو بھی نہ میں نے دور کیا
سنگ ہی ہو تھریسیا، فنچ کوئی، نارنگ بھی مرا ضرغام مرا
وہ زہرہ جبیں وہ چاندنما، وہ پھول سے چہرے بھی میرے
کہنے کا یہ مطلب ہے میرا، کالا بھی مرا گلفام مرا
جو میں نے لگایا اک گلشن اسرار خزاں کے عالم میں
ہر گام پہ اس سے پہنچا ہے خوش بوئے پیغام مرا

✸ ✸ ✸

www.urduchannel.in

جب سورج غروب ہوا...

میں نے حافظ ابن حجر مکی، علامہ عینی، علامہ ابن تیمیہ، امام بخاری، امام مسلم وغیرہ کو نہیں دیکھا مگر ان کی جلالت علم اور علمی خدمات اس پیمانے پر ہیں کہ ان کا کسی صورت انکار نہیں کیا جاسکتا۔ نیز ان کا فیض آج تک جاری و ساری ہے۔ ایسے ہی حضرت مولانا علاؤ الدین مظاہری رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ جن کی شخصیت ان حاملین علوم نبوت کی پرتو ہے جنھوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنی اہمیت کا لوہا منوایا اور ان کے انتقال کے ایک عرصے بعد بھی ان کے کارنامے روشن ہیں۔ وہ ایک عبقری عالم اور مکان علوم کے مینارۂ نور تھے۔ وہ شیخ ہدایت وطریقت بھی تھے اور ایک بے مثال ہستی کے مالک بھی۔ وہ ایک طرف متبحر عالم دین اور اسلامیات کے ماہر بھی تھے تو دوسری جہان بانی و قیادت کی اعلا صلاحیتیں بھی ان میں پوری پوری موجود تھیں۔ ان کی رحلت پر بھی ہر بڑے اور باعظمت انسان کی طرح چمن اجڑا اور نرگس رونے لگی جو ہزار سال تک روتی رہے گی تب کہیں جا کے کوئی حضرت مولانا علاؤ الدین مظاہری جیسا صاحب کمال پیدا ہوگا۔

کسی بھی انسان کی تعمیر میں اعلا افکار اور وقت کے اشاروں کی تفہیم کی صلاحیت بہت بڑا کردار

ادا کرتی ہے۔ایک مرتبہ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے فرزند کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا:

''عزیز من !وقت کے اشاروں کو سمجھنا بہت بڑی دانشمندی ہے،تمھارے اعلا افکار وقت اور زمانے کو نیا آہنگ دے سکتے ہیں،تمھاری بلند فکری سے دنیا کا بگڑا ہوا نظام سنور سکتا ہے۔''

حضرت مولانا علاؤ الدین مظاہری نے حضرت لقمان علیہ السلام کی اس نصیحت پر پورا پورا عمل کیا اور جس طرح انھوں نے اپنے آپ کو سماج اور صالح معاشرے کی تعمیر میں کھپایا ،اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ان کی خدمات اور کارنامے تابندہ نقوش بن گئے جن سے آنے والی نسلوں کے لیے روشنی اور ہدایت مل رہی ہے اور ملتی رہے گی۔

خطۂ بہار کے علمائے کرام کے جھرمٹ میں ایک بات جو حضرت مولانا علاؤ الدین مظاہری کو سب سے ممتاز اور علاحدہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے وطن سے رشتہ نہیں توڑا بلکہ اسے ہی اپنا مرکز بنایا۔بقول مولانا مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی:

''عصری تعلیم گاہوں میں ملازمت کے مواقع اور معاشی استحکام کے تصور کے باوجود انھوں نے مدرسہ عالیہ جوگندریہ کے لیے خود کو وقف کر دیا۔حالانکہ وہ جانتے تھے کہ بہار کا ہیرا دوسرے صوبوں میں جا کر کوہِ نور بنتا ہے،قدر و منزلت بڑھتی ہے اور چمن سے نکلنے کے بعد پھول سر چڑھا کرتا ہے۔لیکن انھوں نے اپنے گاؤں اور اس کے گرد و نواح کو ہی اپنا میدان عمل بنایا۔.....مولانا گاؤں اور سماج کی توقعات پر پورے اترے اور اپنی ہمہ جہت صلاحیت اسی کے لیے لگا دی۔''

یہ صفات کسی ایسی ہی شخصیت کا زیور اور چاند ستارے ہوتی ہیں جسے اپنے سماج اور معاشرے سے لگاؤ ہوتا ہے اور اسے فکر ہوتی ہے کہ میں اپنے گھر میں لگی آگ بجھاؤں ۔ حضرت مولانا تاعمر اپنے گھر میں لگی اس آگ کو بجھاتے رہے اور وہاں کے مکینوں کو صحیح دین و دنیا کے سائبان عطا کرتے رہے۔اس کے لیے وہ ہر حد سے گزرے، فاقوں کی نوبت بھی

www.urduchannel.in

آئی تو اسے انعام الٰہی سمجھ کر خندہ پیشانی سے قبول کیا اور صابرین کے زمرے میں شامل ہوئے۔جب مصائب و آلام کے بادل چھٹے اور زندگی میں وسعتیں آئیں تو سراپا شاکر بن گئے اور شاکرین میں شامل ہو گئے۔زندگی کے امتحانات میں ہمت و حوصلہ قائم رکھا اور نیک ارادوں کی بدولت منزلوں کو پایا۔

حیرت ہوتی ہے کہ ایک ہی تنہا شخص میں اتنی ساری عمدہ صفات جمع ہو گئیں، یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر خاص کرم تھا۔ جسے انھوں تاعمر اپنے سے جدا نہ ہونے دیا۔ان کا قد ہمیشہ بلند رہا۔ انھیں معاصرانہ چشمک سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔یہ ان کی بہترین تدبیر کی ایک عمدہ مثال ہے۔انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ اگر میں نے شہر میں قدم رکھا جہاں کے ہر رگ و ریشے میں سیاست اور دھوکہ دھڑی بسی ہوئی ہے وہاں ضرور کوئی نہ کوئی میرا چشمک ہوگا۔اس لیے کیوں نہ میں گاؤں میں ہی اپنی زندگی گزاروں اور ایمان و عقیدے کی خرابی سے خود بھی بچوں اور دوسروں کو بھی بچاؤں۔

حضرت مولانا علاؤ الدین مظاہری نے گاؤں و اطراف میں رہ کر جس طرح اشاعت حق کا فریضہ انجام دیا، وہ اپنی جگہ ایک تاریخ ہے۔جس جگہ بدعات و خرافات ،عقائد کے بگاڑ اور دین اسلام کی بیخ کنی عروج پر تھی وہاں آپ نے درست عقائد، دین میں غیر ضروری اضافوں اور اسلام کی مسخ ہوتی صورت کو بچایا اور علاقے کو ایسی تنویر عطا کی کہ جس کی روشنی سے پورا بہار جگ مگا رہا ہے۔

بلندیٔ نگاہ، دلنواز سخن اور جاں پرسوزی آپ کے اندر کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی، یہ ایسی صفات ہیں جو مقام انسانیت کو مزید بلند کرتی ہیں اور ان سے ہی اچھے اور بہتر انسان کی پہچان ہوتی ہے۔

دنیا نے حضرت مولانا کی شکل میں ایک آفتاب دیکھا تھا۔جس کا وجود تاریکیوں کی فنائیت کا اعلان ہوتا ہے۔آسمان کا سورج تو کتنی بار ڈوبا نکلا مگر یہ زمین کا سورج ہر آن تابنا کی پھیلاتا رہا۔

6رنومبر 2009 بھی کیا تاریخ تھی جو زمین کے سورج کو لے گئی اور دنیا اس سے محروم ہوگئی، حالانکہ ابھی کچھ گوشے تاریک تھے جن کو روشن کرنا نہات ضروری تھا مگر حکم خداوندی کے آگے کس کا زور چلتا ہے۔وہی ہوا جو منظور خدا تھا.....اور دنیا ایک عظیم ،بہتر عالم و مدبر، نابغہ روزگار مبلغ اور اہم سماجی شخصیت سے محروم ہوگئی۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔آمین!

www.urduchannel.in

ابن صفی کا مشن

امن و انصاف کا فروغ

مذہبی کتابوں اور صحائف کے علاوہ بہت کم ایسی کتابیں اور دستاویز ہوتی ہیں جو انسان کو اچھے برے، صحیح وغلط اور مناسب وغیر مناسب کی تمیز سکھاتی ہیں، انھیں ذمے دار اور معاملہ فہم بناتی ہیں اسی طرح انھیں وقت، حالات، زمانے اور موسم کے تقاضوں سے آگاہ کرتی ہیں نہ صرف یہ بلکہ انھیں سکھاتی بھی ہیں اور تلقین بھی کرتی ہیں۔جاسوسی دنیا اور ادب کے مایا ناز و قابل افتخار نام ابن صفی کا کوئی بھی ناول اٹھائے اور پڑھیے، اس میں جہاں متعدد دلچسپ اور قابل غور باتیں ہوں گی وہیں نمایاں طور پر یہ دعوت اور فکر بھی ہوگی کہ ہم اپنے گرد وپیش کے حالات سے باخبر رہیں اور دنیا میں شر وفساد نہ برپا ہونے دیں۔کھلے عام کسی کو بھی قانون اور انصاف سے کھلواڑ نہ کرنے دیں اور نہ ہی مجرمانہ امور کو فروغ پانے دیں۔اسی طرح کسی کے ساتھ زیادتی نہ خود کریں اور نہ ہی کسی کو کرنے دیں۔اللہ تعالیٰ کا جو نظام ہے اسے کاینات میں نافذ کرنے کی کوشش کریں اور دنیا کا امن وامان غارت کرنے والوں کے خلاف قانون کی مدد کر کے انھیں کیفر کردار تک پہنچائیں۔

ابن صفی کے قارئین ہر دور میں اس احساس سے مرصع رہے ہیں کہ انھیں ملک وملت اور قوم پر آنے والے برے حالات میں کس طرح کے اقدام کرنے ہیں اور ان ناگفتہ بہ حالات سے کس طرح مقابلہ کرنا ہے نیز ان سے محفوظ رہنے کے کیا کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابن صفی کے قارئین چاہے ان کا تعلق کسی بھی طبقے سے ہو وہ کسی کے بہکاوے میں نہیں آتے اور نہ ہی ملک وملت کے سرمایوں کا سودا کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات تو ان کا تحفظ کرتے کرتے جان تک دے دیتے ہیں۔ وہ اپنے ملک کے وفادار اور ملت کے بہی خواہ ہوتے ہیں۔ انھیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں خرید سکتی اور نہ ہی ان کے ''جذبۂ حب الوطنی'' کا سودا کر سکتی ہے۔ ملک وقوم کی صیانت وحفاظت کا فریضہ ادا کرنے میں انھیں ایسی خوشی اور مسرت محسوس ہوتی ہے جیسی قارون کا خزانہ ملنے پر بھی نہیں ہوتی۔ میری اس بات کی تائید کے لیے ابن صفی کے شاہ کار ناول ''تابوت میں چیخ'' کے کردار ''ظفر الملک'' کی مثال کافی ہو گی جو دربدری کی حالت میں ہونے کے باوجود بھی جرائم سے نفرت کرتے ہوئے قانون کی حفاظت کرنے کا عہد کرتا ہے اور 'میوری وتھیلما' کے چکر سے باہر آنے کے لیے تگ ودو کرتا ہے، جس میں وہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے اور پھر عمران کی ٹیم کا ایک بہترین ممبر بن جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام اچھی صفات وہ ہیں جو انسان کو ازل سے ہی ملی ہوتی ہیں مگر وہ شیطان کے بہکاوے میں آ کر حقیقت سے روگردانی کر جاتا ہے۔ مگر جب اسے کوئی یاد دلاتا ہے تو اس کو یہ سب باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ ابن صفی کے ناولوں نے بڑے پیمانے پر انسانوں کو ان کی متاع گمشدہ لوٹانے کا کام کیا اور ان کے مردہ ضمیروں میں عقابی روح پھونکی۔ یہی وجہ ہے کہ ''فریدی''۔ ''عمران''۔ ''صفدر''۔ ''حمید''۔ ''انور۔ رشیدہ'' ان کے کارنامے ہمیں اپنے کارنامے لگتے ہیں اور ان کو پڑھ کر ہمارے اندر یہ احساس پیدا ہونے لگتا ہے کہ ہم بھی خطرات سے کھیلتے ہوئے اور انسانیت دشمن عناصر سے لوہا لیتے ہوئے اسی طرح ظلم وناانصافی اور بدی کا خاتمہ کر سکتے ہیں نیز قانون کی عظمت واہمیت کو دوبالا کر سکتے ہیں۔ لوگوں کو قانون کا احترام کر

www.urduchannel.in

نا اور ظلم سے متنفر ہونا سکھا سکتے ہیں۔ یقینی طور پر یہ بات بھی دلوں میں بیٹھ جاتی ہے کہ یہ کردار کہیں دور کوہِ قاف سے نہیں آئے اور نہ ہی ان کا تعلق کسی ایسے سماج، طبقے اور خاندان سے ہے جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اپنے ہی ہیں اور اپنے لہجے میں بات کرتے ہیں۔

جب نبیوں اور رسولوں سے ان کی امتوں نے سوال کیا کہ..... ''تم نبی کیسے ہو سکتے ہو جب کہ تم کھاتے پیتے ہو، شادی کرتے ہو، ہماری طرح بود وباش اختیار کرتے ہو، ہماری طرح بولتے اور بات کرتے ہو، نبی تو کوئی ایسا ہونا چاہیے جو فرشتہ ہو اور جس کا تعلق ہمارے گروہ سے نہ ہو.....''

اس کا جواب ان کو اس طرح دیا گیا:

''بے شک نبی تم میں سے ہے تاکہ وہ تمھاری زبان بولے اور تمھاری زبان میں تمھیں میرا پیغام پہنچائے۔ تمھیں اچھائیوں کی تلقین کرے اور برائیوں سے روکے۔ تمھارے سماج اور معاشرے میں اس کا رہنا اس لیے ہے تاکہ تم اسے اجنبی اور یگانہ نہ سمجھو اور اس کی باتوں کو سمجھنے سے انکار کر دو۔''

ابن صفی کے ناولوں اور ان کے کرداروں کا ماجرا بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ زبان عوامی، انداز ہلکا پھلکا، اسلوب سلیس اور رواں، کردار ہمارے ہی سماج اور معاشرے کے، کھاتے پیتے، ضرورت مند، دشمنوں سے لڑائی اور مقابلے کے دوران زخمی ہوتے ہوئے اور جعل سازوں کے جعل میں پھنستے ہوئے، مجرموں کے ہتھے چڑھتے ہوئے، گاڑیاں، بندوق، پستول اور بم گولے چلاتے ہوئے۔ قانون کی عظمت اور شان پر قربان ہوتے ہوئے۔ کسی بھی طرح ان میں اجنبیت اور بیگانگی نہیں اور نہ ہی وہ کہیں سے دیومالائی نظر آتے ہیں۔ اپنے انسانی کرداروں کے ذریعے ابن صفی اپنے قارئین کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے ہر کوئی فریدی، عمران، حمید، صفدر، جولیا، ریکھا، خاور، نعمانی، جگدیش، رمیش اور ظفر الملک بن سکتا ہے۔ دلچسپ ترین بات تو یہ ہے کہ ان کے نام بھی ایسے ہیں جو ہمارے یہاں اکثر وبیشتر

پائے جاتے ہیں ۔ہمبا نگ ، رابان ،تھامو، بدرو،نیسن ،ترانزو، بینازوغیرہ جیسے نام نہ ہمارے معاشرے سے میل کھاتے ہیں اور نہ ہی انھیں کوئی اپنانا پسند کرتا ہے۔

بدلتے حالات سے آگاہ ہونے ،سائنسی ،تکنیکی ایجادات سے لیس ہونے اور تعلیم وتدریب سے روشناس ہونے کی دعوت ابن صفی کے ہر ناول کا اہم ترین موضوع ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ یہ ناول انسانیت،انصاف ، برابری ،مساوات ،حق وسچائی اور امانت و دیانت داری کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ بسا اوقات فریدی اور عمران اپنے حریفوں پر قابو پا لینے کے باوجود بھی شرافت وانسانیت کا دامن نہیں چھوڑتے ،دشمن کو اتنی ہی سزا دیتے ہیں جس سے وہ رام اور بے بس ہو جائے اور پھر اسے عدالت کے حوالے کر کے دوسرے جرائم پیشہ عناصر کی سرکوبی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ان کے برخلاف حریف چاہتا ہے کہ اس کا بس چلے تو وہ نہ صرف فریدی وعمران بلکہ ان کے پورے شہر، نظام اور ملک کو کھنڈر بنا کر رکھ دے۔ نہ اسے دشمنوں کی تمیز ہوتی ہے اور نہ معصوموں کی جانوں کا خیال۔

اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ آخر ابن صفی کے ناولوں کا مقصد کیا ہے نیز خود ناول نگار کا مشن کیا ہے؟ حالاں کہ ابن صفی کے ناولوں میں خود اس سوال کا جواب موجود ہے تاہم جو اُن کو پڑھتے ہی نہیں ان کی خدمت میں اتنا معروضہ پیش ہے کہ جس وقت پوری دنیا میں افراتفری ، ہاہا کار اور بدامنی کا دور دورہ پھیلا ہوا ہے۔نہتوں کو بھیڑ کے ذریعے بے دریغ قتل و غارت کیا جا رہا ہے۔ بلا امتیاز عزت وعصمت پامال کی جا رہی ہیں اور بڑی طاقتیں چھوٹے ممالک کو غصب کر رہی ہیں۔ عالم یہ ہے کہ صبح کو جاگنے والا انسان شام کی عافیت کی یقین دہانی نہیں کرا سکتا اور رات کو سونے والے کو دیدنی صبح کا یقین نہیں ہے۔ایسے حالات میں ابن صفی کا مشن ہمہ جہت اور ہر اعتبار سے امن وانصاف کا فروغ ہے۔

وہ چاہتے ہیں انسانیت پھر سے اپنے جامے میں آجائے اور پھر سے دنیا امن وآشتی و محبت واخوت کا گہوارہ بن جائے۔ان کی کوشش ہے کہ ابنائے آدم پھر سے اس سبق کو پڑھ

www.urduchannel.in

لیں جس کی انھیں حق جل مجدہٗ کی جانب سے تلقین ہوئی تھی۔وہ انسانیت کا تحفظ اور ان کی زندگی کی ضمانت چاہتے ہیں۔اسی طرح وہ اپنی اخلاقی اور ادبی ذمے داری سمجھتے ہوئے پوری دنیا کو ان خطرات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی ہستی اور وجود مٹانے کو بے تاب ہیں۔ یہ وہ خُو ہے جو بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

اردو کے مقبول عام ناول نگاروں میں تنہا ابن صفی ہی اس مشن کے مبلغ نظر آتے ہیں حالاں کہ یہ ہر قلم کار کا قلمی ،علمی اور ادبی فریضہ ہے۔ پھر بجائے اس کے کہ ابن صفی کے اس مشن کی تائید کی جاتی اور اسے سراہا جاتا، ایسا نہ ہو سکا۔جس کا ہر اس انصاف پسند کو ملال ہے جو دنیا میں اچھائیوں کا طالب ہے اور بگڑتی صورت حال اسے خون کے آنسو رلا دیتی ہے۔

تقریباً 28 سال ابن صفی اپنے اس مشن پر گامزن رہے اور کبھی کسی سے اس کی اجرت طلب نہ کی۔جس طرح انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والتسلیم زندگی بھر اپنی امتوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتے اور متبعین کو بشارتیں سناتے رہے اور اپنی امت سے کبھی کوئی اجر طلب نہیں کیا۔انھیں دعا دیتے دیتے مولائے حقیقی سے جا ملے۔یہی انداز تھا ابن صفی کا اور یہی ان کا مدعا تھے کہ

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب بندۂ ناشاد

ہاں! بہت کم لوگوں نے یہ فریاد سنی اور وہ ظفریاب ہو گئے۔

✸ ✸ ✸

ماں اور منور رانا

ماں ...دنیا کی ایک عظیم ترین نعمت، قدرت کا بے نظیر عطیہ اور رب العالمین کا ایک نایاب انعام ماں ...جسے قدرت نے اپنے دست خاص سے بنایا اور اس کے رحم میں اتنا رحم رکھ دیا کہ ہائے! بیان سے باہر اور سوچ سے پرے۔ وہ اگر اپنے جگر پارے کو ایک نظر نہ دیکھے تو اس کی بے قراری دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ (ماں کی مہربانی کی یہ چھوٹی سی مثال ہے) ماں ...سمجھنے والوں نے اس کے قدموں تلے جنت تلاش کی اور اس کے آنچل تلے جھلستے سورج سے آرام پایا۔ ماں جس نے دنیا کے ہر انسان کو اپنا خون جگر پلایا اور اسے مدۃ العمر سینے سے لگانے کو بے تاب رہی۔ اسی ماں کا ذکر جس نے راتوں میں جاگ کر ننھی منی جانوں کی پرورش ونشونما کی اور انھیں پروان چڑھا دیا۔ اسی ماں کا ذکر یوں تو سب کرتے ہیں، اس کے لیے نغمے اور ترانے گاتے ہیں اور خوب خوب گاتے ہیں مگر جب منور رانا گاتے ہیں، اس وقت سارے گانے والے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں اور ان کے منہ سے بس اتنا ہی نکلتا ہے کہ منور رانا نے یہ کیا اور کیسے کہہ دیا، ہم وہاں تک کیوں نہ پہنچ سکے اور ہماری چشم بینا ان پہلوؤں پر کیوں نہ پڑی۔ یہی وجہ اور سب سے بڑی بات ہے کہ منور رانا نے ماں کے تمام ثنا خوانوں اور مداحوں سے الگ اپنی راہ چنی اور سب سے پہلے اردو ادب

www.urduchannel.in

کی صنف نظم کی قسم غزل میں ''ماں'' کے عنوان کا اضافہ کرنے کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ اب یہ بات مسلّم ہوگئی کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی ماں کا ذکر ہوتا ہے یا ہوگا اس کی تکمیل منور رانا کے کلام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جنھوں نے ماں کے ایک معمولی اور عام سے رشتے کو اس قدر بلند اور عظیم بنا دیا کہ اس سے اونچی دنیا میں کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ بلکہ منور رانا تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ خدا کی عبادت کے بعد اگر کوئی شے ہے تو وہ ماں ہے۔ جس کی خدمت، جس کی عظمت کا بیان ہزاروں نیکیوں کے حصول کے برابر ہے:

ماں کے پیروں تلے اگر جنت ہے تو پھر میرے خدا
مجھ کو سجدے کی بھی جنت میں اجازت ہو

نقادوں اور استاذ شاعروں کو جب یہ بات کھٹکی اور انھوں نے اپنی مخالفت واعتراض کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''غزل'' تو صرف محبوب کی شان وتعریف، اس کی بے وفائی ومحبت اور چاہت پر مبنی موضوعات پر لکھی جاتی ہے، منور رانا نے یہ کونسی طرح ایجاد کر دی کہ وہ ماں کو کیوں غزل کا موضوع بنا رہے ہیں؟ اس اعتراض کے جواب میں منور رانا نے جو کچھ فرمایا وہ سننے اور گرہ سے باندھ لینے کے قابل ہے۔ کہتے ہیں:

''جب ایک غیر اور معمولی شکل وصورت کی عورت میری محبوبہ ہوسکتی ہے تو میری ماں میری محبوبہ کیوں نہیں ہوسکتی جس نے مجھے برسوں اپنے سینے سے لگائے رکھا نیز جو میرے جنم اور میری پیدائش میں خدا کی ساجھی دار ہے۔''

پھر وہ کہتے ہیں:

معمولی اک قلم سے کہاں تک گھسیٹ لائے
ہم اس غزل کو کوٹھے سے، ماں تک گھسیٹ لائے

☆.....☆.....☆

چلتی پھرتی آنکھوں سے اذاں دیکھی ہے
میں نے جنت تو نہیں دیکھی، ماں دیکھی ہے

منوررانا کا یہ جواب اوراس کے بعد دل میں ہلچل مچادینے والے یہ اشعار ماں کی عظمت اورشوکت کا اعتراف کرانے کے لیے کافی ہیں۔

منوررانا ماں کو صرف تصورات وتخیلات کی ہی نظروں سے ہی نہیں دیکھتے بلکہ حقیقی معنوں میں اس کی پریشان زلفوں میں انھیں امیدوں کے جگنو جگمگاتے محسوس ہوتے ہیں، اس کے الجھے الجھے بالوں میں انھیں اپنی سلجھتی قسمت نظر آتی ہے اوراس کے چہرے کی جھریوں میں انھیں اپنی تقدیر دکھا دیتی ہے۔ بلکہ یہ تو ہے ہی، انھیں ماں کے میلے کچیلے کپڑے بھی متاع عزیز سے کم نہیں ہیں۔ وہ شفاف وتابندہ ستاروں کی جھجھاہٹ پر نازاں آسمان سے کہتے ہیں:

ترے دامن میں ستارے ہیں تو ہوں گے اے فلک
مجھے اپنی ماں کی میلی اوڑھنی اچھی لگی

☆.....☆.....☆

اے اندھیرے دیکھ لے منہ تیرا کالا ہو گیا
ماں نے آنکھیں کھول دیں گھر میں اجالا ہو گیا

ایک مقام پر منوررانا کی اسی خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ملک زادہ جاوید لکھتے ہیں:

.....ماں کو عنوان بنا کر منوررانا نے جو شاعری کی ہے وہ ضرب المثل بن گئی ہے۔.....
منوررانا نے اس موضوع کو غزل کا لباس پہنا کر بڑا فروغ دیا ہے....ان کی ایک کتاب ماں پر ہے جو کہ اردو شاعری کا عظیم سرمایہ ہے۔ حالاں کہ منوررانا سے قبل ماں پر شاعری میں بہت کچھ لکھا گیا مگر باقاعدگی کے ساتھ ماں پر اردو زبان میں غزلوں کی بحروں میں ماں

www.urduchannel.in

کے کردار کو پیش کرنے کا سہرا منوررانا کے سر پر ہے۔ جنھوں نے اس موضوع کو بین الاقوامی بنا دیا بلکہ منوررانا وہ ہیں جنھوں نے ماں کے تعلق کو اپنی شاعری کے حوالے سے بام عروج پر پہنچا دیا۔

ماں بیٹھ کے تکتی تھی جہاں سے مرا رستہ
مٹی کو ہٹاتے ہی خزانے نکل آئے

☆....☆....☆

گھیر لینے کو مجھے جب بھی بلائیں آگئیں
ڈھال بن کر سامنے ماں کی دعائیں آگئیں

آج کے عہد حرص وہوس اور مال ودولت کی غیر مناسب طلب میں انسان اس قدر پاگل بنا ہوا ہے کہ اسے خود کے علاوہ کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا۔ نہ وہ دیکھنا چاہتا ہے اور نہ اسے حاجت ہے۔ جنین کشی اور اسقاط حمل (ابارشن) کا جرم آج ہنر بن گیا ہے۔ مائیں پیٹ میں ہی جنس کی تصدیق وشناخت پر شان سے یہ عمل کر ڈالتی ہیں اور انھیں ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا۔ منوررانا سے پوچھیے، کیا کوئی ماں ایسی ہوسکتی ہے یا ماؤں کو اس طرح کا ہونا چاہیے؟ وہ جواب دیں گے، نہیں صاحب! ماں ہرگز ایسی نہیں ہوسکتی ہے۔ ماں تو وہ ہے:

لبوں پر اس کے کبھی بد دعا نہیں ہوتی
بس اک ماں ہے جو خفا نہیں ہوتی

اور جو مائیں اس طرح کی ہوتی ہیں یا بدعائیں دیتی ہیں اور خفا ہوتی ہیں، وہ کچھ اور تو ہو سکتی ہیں، ماں ہرگز نہیں ہوسکتیں۔.....اور پڑھیے:

اس طرح وہ میرے گناہوں کو دھو دیتی ہے
ماں غصے میں ہوتی ہے تو رو دیتی ہے

ہاں!ہاں!!پڑھتے جایے:

خدا نے یہ صفت دنیا کی ہر عورت میں رکھی ہے
کہ وہ پاگل بھی ہوجائے تو بیٹا یاد رکھتی ہے

اگر آس پاس میں نظر ڈالی جائے تو بہت کم لوگ ایسے ہیں جو وراثت میں ماں کو پانے کی دعا کرتے ہیں یا اگر انھیں مل جاتی ہے تو اس کی سچے دل سے خدمت کرتے ہیں۔ بلکہ ایسے لوگوں کی بھر مار ہے جو جوان ہوتے ہی بیوی بچوں کے ہوکر ماں کی تمام محبتوں، شفقتوں، نوازشوں اور مہربانیوں کو بھول جاتے ہیں اور اگر ان کے حصے میں ماں آجاتی ہے تو اسے اس قدر تکلیف دیتے ہیں کہ وہ نازار و نا تواں ہر دن مرتی رہتی ہے اور گھٹ گھٹ کر جیتی ہے۔ منور رانا کی سنیے۔ وہ وارثت میں اپنے حصے میں ماں کے آنے پر کس قدر مگن ہیں اور ان کی اعلا خیالی کیا ہے۔

کسی کو گھر ملا حصے میں یا کوئی دوکاں آئی
میں گھر میں سب سے چھوٹا تھا مرے حصے میں ماں آئی

☆....☆....☆

مری خواہش ہے کہ میں پھر سے فرشتہ ہو جاؤں
ماں سے اس طرح لپٹوں کہ بچہ ہو جاؤں

منور رانا ماں کو بنیاد زندگی تصور کرتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جہاں بنیاد ہوتی وہاں نمی نہیں ہونی چاہیے اس لیے کہ پھر انسانی زندگی کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔

منوّر ماں کے آگے یوں کبھی کھل کر نہیں رونا
جہاں بنیاد ہو اتنی نمی اچھی نہیں ہوتی

www.urduchannel.in

منور رانا اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں بہت سخت بیمار ہوا۔ اس قدر میں اسے بیماری کو اپنا مرض الوفات تصور کرتا تھا، اس وقت مجھے احساس ہوتا تھا کہ میں نے بہت سی نیکیاں نہیں کیں، عبادات کا میرے پاس انبار نہیں ہے، بھلائیوں سے بھی دامن خالی ہے.....ان ہی دنوں میں نے چند اشعار کہے:

داور حشر تجھے میری عبادت کی قسم
یہ میرا نامۂ اعمال اضافی ہو گا
نیکیاں گننے کی نوبت ہی نہیں آئے گی
میں نے جو ماں پر لکھا ہے وہی کافی ہو گا

ایسا نہیں ہے کہ منور رانا سے پہلے ماں کی ماقبل مذکور خوبیوں اور عظمتوں سے اردو دنیا یا ادب کے جہان میں کوئی واقف نہیں تھا یا ان سے پہلے ماں کا تصور ہی دنیا سے ختم تھا.... سچی بات یہ ہے کہ قلم کاروں اور شاعروں نے ''ماں'' جیسی عظیم ہستی کے متعلق جان بوجھ کر یا ان جانے میں ایسا سوچا ہی نہیں تھا بلکہ خدا لگتی کہوں گا کہ انھوں نے ماں کو اس قابل سمجھا ہی نہیں تھا کہ اس کی عظمت وشوکت کے ترانے گائے جائیں۔ اسی لیے آج منور رانا اور ماں۔ ایک مخصوص و معتبر اصطلاح بن گئی۔ جہاں کہیں ماں ذکر آئے گا وہاں منور رانا کو ضرور یاد کیا جائے گا اور جہاں منور کا نام آئے گا وہاں ماں کی عظمت دلوں میں بس جائے گی۔

ماخذو مراجع

منور رانا۔ ماں۔ مژگاں پبلی کیشن۔ کلکتہ (مکمل کتاب)
بیان منور رانا۔ بہ موقع مشاعرہ و کوی سمیلن۔ پیش کش: ہماری ایسوسی ایشن۔ متحدہ عرب امارات، دبئی۔ 27 ستمبر 2012
ملک زادہ جاوید: منور رانا اور ماں۔ اسباق پونے (ماں کے نام) اپریل تا دسمبر 2009

✹ ✹ ✹

ابنِ صفی، غالبِ ثانی:

جوخطوط میں مکالمہ کرتے تھے

کہتے ہیں کہ ماضی میں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نام اور تخلص کے ایک عالمی شہرت یافتہ شاعر گزرے ہیں۔ جنھیں ان کے زمانے میں ہی شہرت دوام حاصل ہوگئی تھی۔ ان کی عالمی شہرت کا سبب جہاں ان کی آفاقی اور زندہ جاوید شاعری کو بتایا جاتا ہے وہیں ماہرین غالبؔ، ان کے ذریعے اپنے متوسلین اور دوست واحباب کے نام لکھے گئے خطوط کا انداز 'مکالمہ نما' بنادینے کو بھی کہتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں درست بھی ہیں۔ یقیناً غالبؔ نے پہلی مرتبہ خطوط اور نامہ نگاری جیسی صنف میں اس طرز کو متعارف کرایا اور مراسلوں کو مکالمہ بنا کر اپنے مکتوب الیہ ومرسل الیہ حضرات کو مخاطب کرنے کی نئی طرح ڈالی۔ ان میں وہ انھیں کھری کھری بھی سناتے تو نصیحتیں بھی کرتے تھے۔ رازنہاں انھیں بتاتے تھے تو کبھی سربستہ رازوں سے پردے بھی اٹھاتے۔ کبھی ان کی بے وفائی اور ابن الوقتی پر فقرے کستے تو کبھی اپنی سدابہار اور خوشگوار باتوں سے ان کے دل ودماغ مہکاتے تھے۔ کبھی ان کے دکھ، درد کا علاج بھی بتلاتے اور کبھی اپنے درد دل کی دوا طلب کرتے۔ ان سے شکوے شکایتیں بھی

www.urduchannel.in

کرتے اور کبھی ان کا غم بھی بانٹتے تھے۔ جیسے وہ خطوط نہ ہوں روبرو اور گوش بگوش گفتگو کا کوئی ذریعہ ہوں۔

مرزا غالبؔ کی اس نوایجاد صنف پر ہوسکتا ہے ان کے معاصرین نے خامہ پیمائی کی ہو اور اس فن کو زندہ رکھنے وفروغ دینے کی کوشش کی ہو مگر ان کی یہ کوششیں تادیر باقی نہ رہیں بلکہ غالبؔ کے کچھ عرصے بعد یہ فن عدم توجہی کا شکار ہوکر معدوم ہوتا چلا گیا۔ عین قریب تھا کہ ہر شے کی طرح یہ سلسلہ بھی داستان پارینہ ہوجاتا اور لوگ اسے گئے گزرے عہد کی مانند یاد کرتے رہ جاتے، کہ نابغہ روزگار، لازوال تحریروں کے مالک اور عظیم مصنف ابن صفی مرحوم نے اس فن کو نیا لبادہ، نیا انداز اور نیا آہنگ عطا کر کے سدابہار جاسوسی ناولوں کے آغاز میں اپنے قارئین کے خطوط کی روشنی میں 'پیش رس' کے عنوان سے جواب لکھ کر زندہ کردیا اور اپنے ناولوں کے معترضین ومعترفین کے سوالوں، اپنوں وغیروں کے مطالبوں، موافقین ومخالفین کے اعتراضوں، جاسوسی ادب پڑھنے والوں کی فرمایشوں اور گزارشوں کا بے تکلفانہ جواب دے کر ان کو مکالمہ نما بنادیا۔ اس طرح یہ فن دوبارہ زندہ ہوگیا اور ابن صفی مرحوم، غالبؔ ثانی بن گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ غالبؔ سے بھی بازی لے گئے۔ اس لیے کہ غالبؔ کے مکتوب الیہ مخصوص، گنے چنے اور جانے پہچانے لوگ تھے مگر ابن صفی کے مکتوب الیہ یا ان کے نام خط لکھنے والوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا اور نہ ہی ابن صفی ان تمام سے واقف تھے۔ ان میں بعض تو وہ تھے جو ابن صفی کی زبان سے ناوقف بنگالی اور ہندی داں تھے۔ مگر ان سے بھی ابن صفی نے اسی طرح باتیں کیں۔

ذیل میں ابن صفی کے ''پیش رسوں'' کے چند اقتباسات پیش ہیں جن سے یہ حقیقت ہویدا ہوتی ہے اور ابن صفی، مرزا غالبؔ کے طرز پر اپنے مکتوب الیہ ومرسل الیہ سے خطاب فرماتے ہیں۔

O ایک دفعہ جب کہ دنیا بھر میں ازموں کی پیروی کی ہوائیں چل رہی تھیں اور ہر شخص کسی نہ کسی ازم کا پیروکار بن رہا تھا، اسی دوران آپ کے ایک قاری نے دریافت کیا کہ ''آپ کس ازم کے قائل ہیں.....'' تو آپ نے لکھا:

''بھائی میں تو اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا قائل ہوں۔ اس میں اس کی گنجایش نہیں ہوتی کہ جتنے پگ کا نشہ ہو ویسا ہی بیان داغ دیا جائے۔ آپ بھی کسی ازم وزم میں پڑنے کے بجائے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ سارے ازم محض وقتی حالات کے پیداوار ہیں اور کسی ایک ازم کی دشواری کسی زمانے میں دوسرے ازم کی پیدایش کا سبب بنتی رہتی ہے۔

اسلام کے علاوہ کوئی بھی ازم حرف آخر ہونے کا دعوا نہیں کرسکتا۔ اسلامی نظام حیات آج بھی قابل عمل ہے لیکن اس کے لیے انفرادی طور پر ایمان دار بننا پڑے گا اور یہ بے حد مشکل کام ہے۔

پس میرا سیاسی رجحان اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا قیام اور میرا فن سکھاتا ہے قانون کا احترام۔''

''زرد فتنہ'' کے پیش رس میں اپنے قارئین کی خدمت میں سنجیدگی اور فکر کی باتیں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ محض معاملات پر سنجیدگی سے غور کریں۔ زندگی محض ہنسی خوشی کا کھیل نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں ہنسی کھیل کے ذریعے آپ کو زندگی کے حقائق کے قریب تر لانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

نیز آگے لکھتے ہیں:

''بڑا آدمی صرف وہ ہے جس کی تگ و دو صرف اپنی ہی ذات کے لیے نہیں ہوتی۔ اگر مال دار ہوتا ہے تو خود کو ایک چوکیدار سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ اس مال کا چوکیدار جو دراصل اللہ کی ملکیت ہے اور اسے اللہ کے بتائے راستے پر خرچ کرتا ہے.....

www.urduchannel.in

ہم جو کچھ بھی حاصل کرتے ہیں۔ اللہ کی زمین ہی سے تو حاصل کرتے ہیں اور اس پر ہمارے حقوق صرف اس حد تک ہوتے ہیں جو اللہ نے مقرر کردیے۔''

O ایک مرتبہ ایک معترض نے استفسار کیا کہ ''جناب یہ جرائم کیوں بڑھ رہے ہیں؟'' تو ان کے جواب میں لکھا:

''مستقبل سے مایوسی غلط فہمی ہی کی پیداوار ہے اور آدمی کو جرائم کی طرف لے جاتی ہے۔ مستقبل سے مایوس ہوکر یا تو آدمی جرائم کرتا ہے یا پھر ایسے کرنل فریدی کی تلاش میں ذہنی سفر کرتا ہے جو قانون اور انصاف کے لیے بڑے سے بڑے چہرے پر مُکا رسید کرسکے.....''

O ایک صاحب آپ کے فلمی دنیا سے متعلق بے راہ روی کے مستقبل کے اشاروں، نیز سنیما کی بڑھتی برائیوں پر قدغن لگانے کی غرض سے تحریر کیے گئے ناول ''ستاروں کی موت'' پر برافروختہ ہوئے اور لکھا کہ ''آپ جیسے لوگ ہی فلمی دنیا کے متعلق غلط فہمی پھیلا کر شریف گھرانوں کی لڑکیوں کو اس جانب متوجہ ہونے سے روکتے ہیں۔'' تو آپ نے انھیں اس طرح مخاطب کیا:

''بھائی آپ کیوں خفا ہو رہے ہیں۔ شاید آپ کو اس کی اطلاع نہیں کہ سماجی قدریں کس تیزی سے بدل رہی ہیں۔ آج سے پندرہ بیس سال پہلے شرافت کا جو معیار تھا اسے فلاکت زدگی اور جہالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر پردے کو لے لیجیے۔ پہلے یہ شرافت اور اعلا نسبی کی پہچان تھی۔ آج پردہ نشین خواتین کو یا تو نچلے طبقے سے متعلق سمجھا جاتا ہے یا جاہل۔ بہرحال آپ کی مراد بر آنے میں محض دس سال اور لگیں گے کیونکہ ابھی ہمارے یہاں کے شریف آدمی آزادانہ صنفی اختلاط کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کسی قدر ہچکچاتے ہیں۔ صرف.... دس سال اور صبر کیجیے..... یہ خلیج بھی حائل نہ رہے گی .... پھر ہوں گے آپ کے پو بارہ..... لائیے ہاتھ اسی پر.....''

O ایک مرتبہ آپ کے ایک قاری نے ناول ''رات کا شہزادہ'' پر شائع ہوئی تصویر پر

تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ آپ کو تصویر ذرا اچھی کھنچوانی چاہیے تھی، تو آپ نے اس سے کہا:

''کل آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ذرا اپنے چہرے پر سفیدی کرا کے پھول اور پتیاں بھی بنوا لیجیے۔ لیکن یہ آپ اس وقت کہہ سکیں گے جب آپ مجھے قریب سے دیکھیں گے۔ خدا مجھے اس برے وقت سے بچائے۔''

O ایک بنگالی قاری نے جاسوسی ناول پسند نہ آنے پر ابن صفی مرحوم کو ایک گستاخانہ خط لکھا اور اس میں انھیں ناول نگاری ترک کر کے ترکاری بیچنے کا مشورہ دے ڈالا...اس کے جواب میں اس طرح خطاب کیا:

''میں ان چاٹگامی بھائی سے کسی طرح متفق نہیں جنھوں نے مجھے کتابیں لکھنا ترک کر کے ترکاری بیچنے کا مشورہ دیا ہے۔

میاں! میں اتنا بدھو بھی نہیں ہوں کہ تاؤ میں آ کر سچ مچ ترکاریاں بیچنا شروع کر دوں۔ میں جانتا ہوں کہ بچی ہوئی ترکاریاں باسی کہلاتی ہیں۔ سڑ جاتی ہیں پھر ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ لیکن کتابیں.....دس سال پڑی رہنے کے باوجود بھی پوری ہی قیمت پر فروخت ہوتی ہیں۔ مجھے آپ کا یہ مشورہ خلوص پر مبنی نہیں معلوم ہوتا اس لیے میں اس پر عمل بھی نہیں کروں گا۔

پھر آپ نے لکھا' مگر ساتھ ہی یہ بھی عرض ہے کہ آپ نے میرے مشورے پر عمل کرنا شروع کر دیا تو مجھے بہت افسوس ہوگا۔ مگر میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ آئندہ بھی آپ کتابیں لکھتے رہیں۔''

عقل ضبط کر دی آپ نے تو۔ یعنی مجھے ترکاریاں بیچتے دیکھ کر بھی آپ کو افسوس ہوگا اور آپ یہ بھی نہیں چاہتے کہ میں کتابیں لکھتا رہوں۔ تو پھر کیا خیال ہے میں آپ کی محبت میں فاقے شروع کر دوں؟

بھئی اپنا نام تو صاف لکھا کیجیے۔ پہلی نظر میں 'بدھو داس' معلوم ہوتا ہے۔ غور کرو تو 'رولز

www.urduchannel.in

رائس' پڑھا جاتا ہے۔ ذرا ترچھا کر کے دیکھو تو ''چلو واپس' گھسیٹا ہوا معلوم ہوتا ہے۔''

یہ اور اس طرح کے بہت سے نمونے ہیں جنھوں نے ابن صفی کے فن کو نمایاں اور تابناک بنا دیا اور انھیں مرزا غالبؔ کے بالمقابل لا کھڑا کیا۔ اہم ترین بات یہ ہے ابن صفی کی ان 'پیش رسی' تحریروں کی آج بھی وہی اہمیت و معنویت ہے جو ان کے عہد میں تھی۔ غالبؔ کا قصہ تو تمام ہو چکا اور ان کا فن وہیں تک محدود ہے جہاں انھوں نے چھوڑا تھا مگر ابن صفی کا فن نئی نئی جہات اور طرز سے فروغ پذیر ہے۔

ماخذو مراجع

دھواں ہوئی دیوار: مارچ 1969

زرد فتنہ: اگست 1971

مہلک شناسائی: نومبر 1968

ستاروں کی چیخیں: دسمبر 1964

دھواں اٹھ رہا تھا: اکتوبر 1959

✹ ✹ ✹

صدف اقبال کے افسانوں

میں عہد موجود کی کشاکش!

ایک مرتبہ اردو مخالف گروہوں کی مجلس میں ایک سوال اٹھایا گیا: 'افسانہ کیا ہے؟ اور اس کی کیا ضرورت ہے؟ آج اس کے وجود کا کیا جواز ہے کیا افادیت ہے؟ کیوں نہ اس کی گردن بے تکلف اڑا دی جائے۔!' ایک مشورہ یہ بھی آیا۔

جوابات آئے:

'بگڑے وقتوں کی یادگار ہے جس کی اب کوئی ضرورت نہیں۔'

'داستانوں کا وجود تو ختم ہو گیا، اس کا بھی ہو جانا چاہیے۔'

'آج افسانے کے وجود کا کوئی جواز نہیں چوں کہ اب یہ افادی صنف نہ رہی۔

'ہاں! افسانے کی گردن بے تکلف اڑا دینی چاہیے۔'

اور پھر یہ گروہ اپنا ناپاک مقصد پورا کرنے کے لیے کمر بستہ ہوا ہی تھا کہ ایک خوبصورت 'افسانوی' وجود نے ان کا راستہ روک لیا:

'ٹھیریے! کیا کہا، افسانہ بگڑے وقتوں کی یادگار ہے؟ کیا فرمایا، داستانوں کی طرح

www.urduchannel.in

افسانے کو بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ اور ہاں! یہ کیسے کہہ دیا کہ آج افسانہ کوئی افادی صنف نہیں ہے لہٰذا اس کا وجود بے کار ہے اور اس کی گردن بے تکلف اڑا دینی چاہیے.... سنیے! حقیقت یہ نہیں ہے جو آپ کے ذہنوں میں سمائی ہوئی ہے، یہ ایک غلط فہمی ہے اور گمراہ کن خیال جو مخصوص اور محدود سوچ وفکر کا نتیجہ ہے۔ سچائی یہ ہے کہ افسانہ کے جہاں دیگر معانی ہیں ان میں ایک معنا ایسا بھی ہے جس پر عموماً غور ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ افسانے کے اصل معنا وہی ہیں اور وہ ہیں 'روئیداد زندگی'۔ یعنی انسان پر جیسی بیتتی ہے، جیسی گزرتی ہے اور جن حالات کا اسے سامنا کرنا پڑتا ہے یا جیسی صورت حال وہ دیکھتا ہے اور اسے دکھائی جاتی ہے، اگر وہ اسے لکھ ڈالے تو وہ 'افسانہ' بن جاتا ہے۔ حقیقت تو پھر اس میں اپنے آپ ہی آجاتی ہے۔ ویسے بھی جدید عہد کا افسانہ عہد قدیم کے افسانوں سے بالکل جدا اور حقیقت کا ترجمان ہے۔'

'میں نے مانا کہ ماضی کا افسانوں میں من گھڑت حکایات وداستانوں کا پہلو ہوتا تھا بلکہ وہ سراپا ہی من گھڑت اور فرضی کہانیوں کا مجموعہ ہوتے تھے مگر آج کا افسانہ زندگی کا عکاس، سماج کا مظہر اور تیزی سے بنتے بگڑتے سیاسی، سماجی معاشرتی، ملکی، عالمی اور جغرافیائی حالات کا بیان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج غزل کی مانند افسانوں کے موضوعات میں بھی تنوع ووسعت ہے۔ چنانچہ المیہ افسانے ہی نہیں آج 'احتجاجی' افسانے بھی لکھے جا رہے ہیں۔ کل 'سیاسی' لکھے جائیں گے اور پرسوں 'صنعتی اور گلوبلائزیشن سے وابستہ' اس سے اگلے دن 'معاش اور روزگار' سے متعلق افسانے ہوں گے اور اگلے دن ان کا کوئی اور موضوع ہوگا۔'

یہ دل چسپ مکالمے ایک طرف، دوسری طرف یہ ہے کہ ہاں! واقعی 'افسانہ' موجودہ وقت کی اہم ضرورت اور حالات کا شدید ترین تقاضا بھی ہے، جس کے اصولوں پر ایک قلم کار کا کھرا اترانا نہ صرف قلمی فریضہ ہے بلکہ انسانی حق بھی ہے۔

عہد موجود کی معروف افسانہ نگار 'محترمہ صدف اقبال' کا شمار ایسے ہی افسانہ نگاروں میں

ہوتا ہے جنھوں نے جدید موضوعات، ہنگامی حالات اور متقاضی احوال کے مطابق افسانے لکھے اور 'فیس بک' جیسی سماجی رابطے کی معروف ومقبول سائٹ پر 'عالمی افسانہ فورم' قائم کر کے دنیا بھر کے قلم کاروں کو مہمیز کیا اور دوسرے لفظوں میں ان کے لیے ایسا پلیٹ فارم مہیا کیا جہاں سے وہ آج کے سیاسی، سماجی، معاشی، صنعتی اور جاگیردارانہ برہم و ناگفتہ بہ حالات کی ستم ظریفیوں کے خلاف کبھی 'صور احتجاج' کبھی 'صدائے حق' اور کبھی 'نوائے وقت' بلند کر سکیں۔

محترمہ صدف اقبال بھی بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں اور ان کے افسانوں میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنے متعینہ اصولوں و ضابطوں پر عمل پیرا ہو کر اردو دنیا سے اپنا لوہا بھی منوایا ہے۔ وہ اپنے افسانوی 'صور' کے ذریعے حالات کے برہم گیسو سنوارنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور آج کے غیر متوقع حالات میں احساس سے عاری انسانوں کے سوئے ہوئے جذبات بیدار کرنے اور انھیں اپنے فرائض کے تئیں حساس و ذمے دار بنانے کی جدوجہد بھی کر رہی ہیں۔ ایک جھلک ملاحظہ کیجیے:

''بہو جب صبح کا ناشتہ دینے آئی تو انہیں غلاظت میں لپٹا ہوا پایا۔ وہ ناک پر دوپٹہ ڈال کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ نوکر کو بھیج کر ان کی صفائی کروائی۔

بہو کے زور زور سے بولنے کی آواز ان کے کانوں تک بخوبی پہنچ رہی تھی۔ سجاد کی مجرمانہ خاموشی بھی وہ لیٹے لیٹے محسوس کر رہے تھے۔

اچانک زور سے برتن پٹخنے کی آواز آئی۔

بڑی بی تو آسانی سے دنیا سے سدھار گئیں اور بڑے بھائی بھابی کو آرام دے گئیں۔ یہ بڑے میاں تو لگتا ہے امرت پی کر آئے ہیں۔ ان کی خدمت عمر بھر کے لیے میرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے---- بڈھا مرتا بھی نہیں۔''

www.urduchannel.in

یہ محض ایک افسانچہ ہی نہیں ہے کہ بلکہ ہمارے سماج اور معاشرے، گھروں اور اکیسویں صدی کی ایک زندہ حقیقت ہے۔ جن بزرگوں نے ہمارے گھر، تنکا تنکا، اینٹ اینٹ، پتھر پتھر اور ٹکڑے ٹکڑے جمع کر کے بنائے، جب ان کی عمر اس منزل پر پہنچ جاتی ہے جہاں انھیں سہاروں اور آسروں کی ضرورت ہوتی ہے، اس وقت ہمارا رویہ ان کی توقعات کے خلاف ہوتا ہے اور ہم انھیں ایک ناقابل برداشت بوجھ سمجھتے ہیں اور ایک ایسا وجود جو لاشئی ہوتا ہے۔ کاش ایسا کرتے وقت ہم اپنے کل کے بارے میں سوچیں! مگر نہیں سوچتے۔ جیسے ہم ہی جوانی کا 'امرت' پی کر آئے ہوں۔ حالاں کہ جوانی سے بڑھاپا آنا کوئی انوکھی اور شاذ و نادر بات نہیں ہے بلکہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ہمارے سامنے روز دہرایا جاتا ہے۔ ہر دن لوگ جوانی سے بوڑھاپے کی طرف جاتے ہیں اور روز بوڑھے ہوتے ہیں۔ مگر عقلوں پے جو پردا پڑا ہے اسے کون اتارے اور کیوں اتارے؟ یہی بات ہے جس نے انسانوں کو گم راہی میں ڈال رکھا ہے۔

برائیاں کس سماج میں نہیں ہوتیں، اچھائیوں کے دشمن کس معاشرے میں نہیں ہوتے، نیکیاں برباد کرنے والے کہاں کہاں نہیں ہوتے؟ مگر افسوس جس طرح برائیاں کرنے والے ہمارے سماج میں ہیں، جس طرح اچھائیوں کے دشمن ہمارے معاشرے میں ہیں اور جس طرح نیکیاں برباد کرنے والوں کا سلسلہ یہاں ہے ایسا کہیں بھی نہیں۔ دل چسپ بات تو یہ ہے کہ اسے 'حکمت عملی' کا نام دیا جاتا ہے اس کے بعد معترض کا نہ کچھ کہنے کا منہ ہوتا ہے اور نہ ہی حوصلہ اور اس 'حکمت عملی' کی آڑ میں پاجی انسان وہ سب کر گزرتا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہیے۔ صدف اقبال کا افسانہ 'حکمت عملی' اسی کا عکاس اور بیان ہے۔ ذیل میں اسی افسانے کے چند اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''دوسرے دن انھوں نے اپنی سفید داڑھی کو مہندی لگا کر سرخ کیا۔ بہترین کرتا زیب تن کیا۔ عطر کی پوری شیشی خود پر انڈیلی۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا اور بسم اللہ کر کے گھر سے باہر دایاں قدم پہلے رکھا۔ اپنے دو قریبی ساتھیوں کو لیا اور کہیں نکل گئے۔ چند گھنٹوں کے بعد ایک سرخ گٹھڑی کو لے کر گھر میں داخل ہوئے۔ دونوں بہوؤں اور بیٹوں نے حیرت بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ گھر کے سبھی افراد کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب خراماں خراماں بڑھ گئے۔ سرخ گٹھڑی کو باہوں کے حلقے میں لے کر محبت سے پلنگ پر بیٹھایا۔ گھونگھٹ سرکا کر چہرہ اُوپر کیا۔

''ماشاءاللہ''—— ان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

جوانی کی آنچ سے دمکتا چہرہ۔ بھرے بھرے خوبصورت ہونٹ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ لامبی پلکیں بند تھیں۔ ناک اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ تراشا ہوا جسم۔ ہر عضو سے گویا آنچ نکل رہی تھی۔ وہ ایک شعلہ تھی۔ سراپا آگ۔ ان کے راکھ بھرے جسم میں ایک چنگاری ہلکے سے سلگی۔ وہ ساری رات اپنے ٹھنڈے جسم کو جوانی کی آنچ سے گرم کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ صبح جب وہ کمرے سے باہر نکلے تو بہویں انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ برتن پٹکنے لگیں۔ منہ ہی منہ میں بھنبھنانے لگیں۔ بیٹے تنا ہوا چہرہ لیے بیٹھے تھے۔ چند گھنٹوں کے بعد بیٹیاں بھی آگئیں۔ گھر کے ہر کونے سے ملامت اور طعنوں کی بارش ہونے لگی۔ طنز کے نشتر چلنے لگے۔

مولانا کافی دیر تک باہری کمرے میں بیٹھ کر اندر کی آوازوں پر کان دیے رہے اور خاموشی سے حقہ گڑگڑاتے رہے۔ بلا آخر انہیں بھی غصہ آ گیا۔ انھوں نے فیصلہ سنا دیا کہ نکاح ثانی کر کے کوئی جرم نہیں کیا۔ انہیں خدمت کے لیے ایک شریک حیات کی ضرورت تھی۔ انہوں نے شریعت کو مدّنظر رکھتے ہوئے بیحد درست فیصلہ کیا ہے۔ جسے ان سے اختلاف ہے وہ گھر چھوڑ کر جا سکتا ہے۔

بیٹے اور بہوؤں پر ان کی دھمکی کا فوراً اثر ہوا۔ سب خاموش ہو گئے۔ بیٹیاں روتی ہوئی

www.urduchannel.in

سسرال سدھار گئیں۔ آرام و آشائش سے بھری حویلی چھوڑ کر کون بے وقوف جانا چاہتا تھا۔ یہ سارے ٹھاٹ باٹ مولانا کے دم سے ہی تو تھے۔ تیس سال پہلے جب وہ اس گاؤں کی مسجد میں پیش امام بن کر آئے تھے تو غربت اور افلاس سے چور تھے۔ فاقہ کشی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔'

دوسرا اقتباس:

''.....ان ہی دنوں مدرسے میں اساتذہ کی بحالی ہوئی۔ ایک جوان حافظ قرآن بھی بحال ہوا۔ جوانی کے نشے میں چور۔ سینے میں قرآن کی ٹھنڈک تھی پر آنکھوں میں ہوس کی چنگاری جلا کرتی۔ انہوں نے اس کی فطرت کو اس کے اتاؤلے پن کو گہرائی سے جانچا پرکھا اور اس پہ بے انتہا مہربان ہو گئے۔ گھر کے اندر بے روک ٹوک آنے کی اجازت دے دی۔ گھر کا فرد کہہ کر بیوی کو پردہ کرنے سے منع کر دیا۔ اور ایک دن بڑی چالاکی سے اپنی بیوی کو اس کے گلے میں منڈھ دیا۔ گاؤں والوں کے سامنے وسیع قلبی دکھائی طلاق دی اور عدّت پوری ہونے پر خود ہی بہتے آنسوؤں اور ہچکیوں کے ساتھ اُن دونوں کا نکاح پڑھایا۔ گاؤں والے انکے ظرف کے قائل ہو گئے۔ گھر گھر میں انکی ایثار و قربانی کا چرچا ہونے لگا۔ مولانا کو بڑی آسانی کے ساتھ ایک حسینہ مل گئی۔ انہوں نے اس کے ساتھ بہت خوشگوار ازدواجی زندگی گزاری۔ ہر سال باقاعدگی سے ایک بچہ پیدا کیا۔ چھ بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا کرنے کے بعد زچگی کی زیادتی سے ان کی بیوی بیمار رہنے لگی۔

دن بہ دن صحت گرتی گئی اور پھر آخر میں دس سالوں تک وہ مسلسل بستر پر رہی۔ انہوں نے اسکی بہت خدمت کی۔ تیس سالوں کی طویل رفاقت کے بعد مرحومہ جنت سدھاری۔''

تیسرا اقتباس:

''انھیں یاد آیا پرانے زمانے میں عرب میں عورتوں کے اعضاء میں تالا لگانے کا دستور تھا۔ آج بھی دنیا کے چند خطوں میں یہ رسم پرورش پا رہی ہے۔ وہ بھی تالا لگانا چاہتے تھے پر نہ اب وہ زمانہ تھا اور نہ ویسی عورتیں جو بخوشی تالا لگوا لیں۔ وہ سوچتے رہتے مسئلے کا حل

ڈھونڈتے رہتے۔خود ہی تجویز نکالتے خود ہی مسترد کر دیتے۔آخر انہیں ایک حل مل ہی گیا۔چند دنوں کے بعد مولانا بے فکری سے ڈاڑھی میں کنگھا کر رہے تھے اور زیر لب گنگنا رہے تھے:

میں مدینے چلا، میں مدینے چلا
جھومتا جھامتا میں مدینے چلا

بستر پر زرد شکل لیے ان کی بیوی پڑی ٹکر ٹکر انہیں دیکھ رہی تھی۔ایک دن قبل اُس کی نس بندی ہو چکی تھی۔''

یہ تینوں اقتباس چیخ چیخ کر اس حقیقت کو بیان کر رہے ہیں جو ہمارے سماج و معاشرے کا بدنما داغ ہے مگر اسے کیا جاتا ہے اور بہانے بہانے سے بار بار دہرایا جاتا ہے۔کسی کی زندگیاں برباد ہوتی ہیں، کسی کی جان پر بنتی ہے اور ان کی اداٹھیرتی ہے یا اداکاری کا نادر نمونہ۔

پتا نہیں اسے المیہ کہا جائے گا یا طربیہ کیفیت ۔انسانوں کی ایک تیسری قسم بھی ہے۔جس کے لیے 'متروک نسلیں' کا نام صدفی صد موزوں ہے۔عبداللہ حسین نے تو 'اداس نسلیں' لکھ کر گویا فرض پورا کر دیا مگر ایسا بھی تو ہے کہ کچھ نسلیں وہ ہیں جو اداس نہیں، محروم و متروک ہیں ۔ان کے لیے کون لکھے گا اور کون ان کے متعلق سوچے گا۔خوش آیند بات یہ ہے کہ 'عبداللہ حسین' کے پچاس سال بعد ہمارے عہد میں ایک فرد ایسا پیدا ہوا جس نے 'متروک نسلیں' لکھ کر اس نسل کے مسائل، مصائب اور پریشانیوں کے متعلق سوچا اور اپنا مافی الضمیر ادا کر کے پوری نسل انسانی کی جانب سے 'فرض' پورا کیا جو 'کفایہ' بھی ہو سکتا ہے اور 'عین' بھی۔

''میں ایک ہیجڑہ ہوں پیدائشی ہیجڑہ۔جانے خدا نے ہماری یہ تیسری صنف کیوں بنائی ہے۔کیا مقصد ہے اس کا۔شاید اپنی دل لگی کا سامان کیا ہوگا۔مجھے کس نے پیدا کیا میرے والدین کون ہیں یہ تو نہیں معلوم پر مجھے بھی میری ماں نے نو ماہ اپنے پیٹ میں رکھا

www.urduchannel.in

ہوگا۔میرا بھی کوئی باپ ہوگا جس نے میری پیدائش کے دن گنے ہونگے۔میں یونہی تصور کرتا ہوں کہ میری پیدائش پر کیا ہوا ہوگا۔شاید جب میں پیدا ہوا ہونگا نا، دایہ نے میری جنس کی شناخت کے لیے تجسس کے ساتھ میرے ناف کے نیچے نظر ڈالی ہوگی۔اور چیخ پڑی ہوگی۔

''بیگم صاحبہ آپ نے ہیجڑہ جنا ہے''۔ماں نے شرمندہ ہو کر آنچل میں یوں منہ چھپایا ہوگا جیسے مجھے پیدا کرنے میں سراسر قصور اسی کا ہو۔نہ میری پیدائش پر خوشیاں منائی گئی ہوں گی اور نہ مٹھائی بانٹی گئی ہوں گی۔عام رواج ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو ہیجڑوں کی ٹولی کو بلا کر گیت ڈھول بجایا جاتا ہے۔ان سے ناچ گانا کرایا جاتا ہے۔پیسے اور کپڑے دیے جاتے ہیں۔شاید میری پیدائش پر بھی ہیجڑوں کی ٹولی کو بلوایا گیا ہوگا اور انہیں پیسے اور کپڑے کے بجائے مجھے ہی دے دیا گیا ہوگا۔پھر میں سوچتا ہوں نہیں ایسا نہیں ہوا ہوگا۔کوئی ماں باپ اتنے ظالم نہیں ہوتے کہ اپنی اولادیوں کسی کو دے دیں چاہے وہ ہیجڑہ ہی کیوں نہ ہو۔پھر میں ان ہیجڑوں کے درمیان کیسے آیا۔شاید میں گناہ کی پیداوار ہوں گا مجھے کوڑے پر پھینک دیا گیا ہوگا اور اتفاقاً مجھے ایک ہیجڑے نے ہی اُٹھایا ہوگا۔پتہ نہیں حقیقت کیا تھی مگر سچ یہ تھا کہ میں ایک ہیجڑے کی گود میں پلا تھا۔رانی ہی میرا سرپرست تھا۔میں کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟''

☆...☆...☆

مگر اس خوبصورت وقت کا دورانیہ نہایت مختصر ثابت ہوا۔یہ طلسم جلد ہی ٹوٹ گیا۔

جب میں آٹھویں کلاس میں تھا تب میرے سیاہ دنوں کا آغاز ہوا۔میری آواز تبدیل ہونے لگی۔ہونٹوں کے اوپر بالوں کی مہین سی لکیر نظر آنے لگی۔اسکول کے سارے بچوں کے لئے یہ بیحد حیرت کی بات تھی۔ان کے ہاتھوں میں ایک مشغلہ آ گیا۔میں ان کے لیے ایک تفریح کا سامان بن گیا۔میں بیحد دل برداشتہ ہوا مگر جب نیلو بھی مجھ سے کترانے لگی تو میں بری طرح ٹوٹ گیا۔اندر سے مرنے لگا۔میں پھر سے تنہا اور ادھورا ہو گیا۔ایک دن میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

''نیلو اب تم مجھ سے باتیں نہیں کرتیں۔میرے ساتھ نہیں رہتیں۔دوستی کیوں ختم کردی تم نے۔''

اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے غور سے میرا چہرہ دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولی:

'میں کسی بھاری آواز والی اور مونچھوں والی سے دوستی نہیں کرسکتی۔

اس ایک جملے نے مجھے سرعام ننگا کردیا۔میں چھپ چھپ کر گھنٹوں روتا دن میں کئی کئی بار شیو بناتا۔اپنی آواز کو حتی الامکان مہین کرکے بولنے کی کوشش کرتا۔ہر روز ٹوٹتا اور خود کو نئے سرے سے جوڑتا۔

☆...☆...☆

میرا واحد مقصد علم حاصل کرنا تھا۔اونچی تعلیم حاصل کرنی تھی مجھے۔سماج میں مقام بنانا تھا۔یہ وقت امتحان کا وقت تھا۔مجھے یقین تھا اگر میں ابھی ثابت قدم رہا تو آئندہ کامیابیاں میرے قدم چومیں گی۔

میں ناخواندہ ہیجڑوں میں علم کی شمع جلانا چاہتا تھا۔مجھے معلوم تھا یہ ڈگر آسان نہیں مگر میرا عزم میرا حوصلہ میرے ساتھ تھا۔مجھے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا حق تھا۔اور مجھے اپنے حق سے محرومی گوارا نہیں۔میں اپنے ماحول سے فرار چاہتا تھا۔بھاگ جانا چاہتا تھا۔اس گھنونی دنیا کو دیکھ دیکھ کر گھبراہٹ محسوس ہوتی۔لگتا ایک ان دیکھی آگ ہے جو جسم و جاں کو جلا رہی ہے۔ایک دن میں راکھ ہو جاؤں گا۔روح میں چھالے پڑے ہوئے تھے۔میں ایک عام انسان کی مانند جینا چاہتا تھا۔لوگوں سے گھلنا ملنا چاہتا تھا۔میں دنیا والوں کو بتانا چاہتا تھا کہ ہم بھی حساس ہوتے ہیں۔تمہارے رویے تمہاری آنکھوں سے جھانکتی نفرت ہمیں مار دیتی ہے۔یہ ہتک بھرا رویہ جو تم لوگ روا رکھتے ہو ہمیں سلگا دیتی ہے۔پھر ہم بدلہ لینے لگتے ہیں۔بسوں اور ٹرینوں میں تمہیں تنگ کرتے ہیں۔شور کرتے ہیں۔پیسے چھین لیتے ہیں۔کیوں؟ کیونکہ تمہارے رویے ناقابل برداشت ہیں۔یہ آنکھوں سے جھانکتی نفرت ہمیں سلگا دیتی ہے۔پھر ہم تمہیں خوفزدہ کرتے ہیں دھمکاتے

www.urduchannel.in

ہیں۔اس طرح شائد ہم اپنی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ہمیں بھی یہ کائنات حسین معلوم ہوتی ہے۔ہمیں بھی رنگ خوشبو پھول کا حسن متاثر کرتا ہے۔ہم بھی کبھی بے انتہا مسرت محسوس کرتے ہیں کبھی غم زدہ ہوتے ہیں۔ہمارے سینے میں بھی ایک جذبات سے بھرا گوشت پوشت کا دل دھڑکتا ہے۔ہم بھی انا پرست ہوتے ہیں۔ہمیں بھی محبت اور نفرت کرنے کا ہنر معلوم ہے۔ہمیں بھی محبت اور نفرت کرنے کا ہنر معلوم ہے۔ہمیں عضو معطل مت سمجھو۔ہم سماج کا سڑا گلا انگ نہیں ہیں ہمیں بھی جینے اور زندہ رہنے کا حق ہے۔ہم کسی دوسرے سیارے کی مخلوق نہیں جو تم لوگ ہمیں اس قدر اچنبھے سے دیکھتے ہو۔الفاظ میرے اندر شور مچاتے رہتے۔میں خود سے ہی ہم کلامی کرتا رہتا۔میں نے ایم،بی،اے کیا۔مجھے بینک کی نوکری پسند تھی میں اسکے امتحان کی تیاری کرنے لگا۔رات دن کتابوں میں سر دیے رہتا۔کل ہی میرا ایک ہم عمر ہیجڑہ میری پڑھائی کا مذاق اڑا رہا تھا۔

☆...☆...☆

'بالآخر میں نے پی،او کا امتحان نمایاں کامیابی سے پاس کرلیا اب صرف میرا انٹرویو باقی تھا مجھے یقین تھا کہ میں یہ انٹرویو بہ خوبی پاس کر جاؤں گا۔کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ایک روشن اور تابناک مستقبل باہیں پھیلائے میرا منتظر تھا۔میرے جسم کی ساری سوئیاں نکل چکی تھیں۔بس پلکوں کی سوئیاں کی باقی ہیں۔میں خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگا۔انٹرویو سے ایک رات پہلے میری کامیابی کی خوشی میں رانی نے دعوت کی اور ہیجڑوں کی محفل سجائی۔سبھی کو جی بھر کر شراب پلائی۔میں نے بھی اس دن کئی پیگ شراب پی اور پیروں میں گھنگھرو باندھ کر خوب ناچا۔خوشی سے میرا انگ انگ رقص کرنے لگا دل چاہا میں ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتاؤں کہ کل کا سورج میرے لیے نئی زندگی کا پیغام لانے والا ہے۔رات کی تاریکیاں چھٹ رہی ہیں۔سحر نمودار ہو رہی ہے۔ایک روشن مستقبل مجھے آوازیں دے رہا ہے۔میں نے انٹرویو والے دن پوری تیاری کی۔بہترین ساڑی زیب تن کی۔بالوں کو نئے ہیئر اسٹائل میں سنوارا۔پیروں میں میچنگ خوبصورت سینڈل پہنی۔دیدہ زیب پرس

ٹانگا۔میں ظاہری طور پر بھی وہاں آنے والی خواتین سے کم نہیں لگنا چاہتا تھا۔پتہ نہیں کیوں ایک بے قراری سی تھی۔نامعلوم سی بے چینی پورے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

رانی اور چند دوسرے ہیجڑے بھی میرے ساتھ آ گئے تھے اور باہر رک کر میری کامیابی کی دعائیں کر رہے تھے۔ایک ایک کر کے نام پکارا جا رہا تھا۔باری باری امیدوار اندر جا رہے تھے۔کچھ چہرے چمک لیے واپس آ رہے تھے اور کچھ بجھے ہوئے مایوس چہرے۔میں ایک ایک چہرے کو بغور دیکھتا رہا اور پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔

خدا خدا کر کے میرا نام بھی پکارا گیا۔میں دھڑکتے دل کے ساتھ اندر کمرے میں داخل ہوا۔ایک میز کے گرد چند لوگ بیٹھے تھے۔کئی آنکھیں ایک ساتھ میری طرف اٹھیں اور مسکرائیں۔

ایک ہاتھ نے مجھے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے کرسی پر جا بیٹھا۔

''میں آپ کو مسٹر کہوں یا مس''-----ایک آواز ابھری۔

''یہ دو جنس کے درمیان جھولتا ہوا ادھورا انسان ہے۔مسٹر یا مس نہیں ہے یہ۔''ہلکی آواز میں دوسرے چہرے نے کہا۔

مجھے ایسا لگا اُنکی آنکھوں میں تمسخر ہے تضحیک ہے۔مگر میں نے اسے اپنا وہم گردانا۔انہوں نے مسکراتی آنکھوں اور سنجیدہ چہرے کے ساتھ میرا انٹرویو لیا۔میں نے اعتماد کے ساتھ سب سوالوں کا تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کی۔

انہوں نے انٹرویو ختم کرنے کے بعد مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

''سر میں امید رکھوں''------میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ایک ہفتہ کے اندر آپ کو نتائج کی خبر کر دی جائے گی۔''

میں امید کا جگنو مٹھی میں تھامے باہر نکل آیا۔

لمحہ لمحہ انتظار اور اضطراب میں کٹا۔چار پانچ دنوں کے بعد میل کے ذریعہ اطلاع دی گئی کہ

www.urduchannel.in

میرا انتخاب نہیں ہوا۔

☆...☆...☆

''ارے یہ تو وہی ہے جس کا آج ہم نے انٹرویو لیا تھا''-----ایک بھاری چہرے والے نے کہا۔

''ہاں میں وہی ہوں۔کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس بار میرا انتخاب ہوا یا ہمیشہ کی طرح مسترد کر دیا گیا ہوں۔''

''ہمیں افسوس ہے خانہ پری کے لیے تمہارا انٹرویو لیا گیا۔مگر ہم تمہیں منتخب نہیں کر سکتے۔''

''کیوں نہیں کر سکتے۔کیا مجھ میں اہلیت نہیں۔کیا میں اس عہدے کے لائق نہیں۔آپ مجھ پر میری صلاحیتوں پر اعتماد تو کریں۔امید ہے میں کھرا اتروں گا۔''میں نے لب کشائی کی۔

''ایک ہیجڑے کو نوکری دے کر ہم سارے بینک کو ہیجڑہ بنا دیں۔نہیں ہم ایسی غلطی نہیں کر سکتے''------ایک نے دوسرے کو مخاطب کیا۔

''ہماری اہمیت تسلیم کی جا چکی ہے۔ہمیں بھی قانونی طور پر تیسری صنف کا درجہ حاصل ہے۔ہم بھی اس منصب کے دعویدار ہیں''------میں نے احتجاج کیا۔''چونکہ تم نے امتحان پاس کیا تھا اس لیے ہم تمہارا انٹرویو لینے پر مجبور تھے۔مگر تمہیں کامیاب کرنا ہماری مجبوری نہیں تھی۔ہم اپنے بینک میں ایک ہیجڑے کو یہ اہم عہدہ نہیں دے سکتے۔بینک کی ساکھ پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔جو ہمیں گوارہ نہیں۔''ایک بے حد سنجیدہ صورت نے کہا۔

''تمہارا سلیکشن نہیں ہوا۔اب تم یہاں سے جاؤ۔لوگ متوجہ ہو رہے ہیں۔''ایک نحوست بھری آواز ابھری۔

مجھے لگا کسی نے اچانک آسمان کی اونچائی سے مجھے گہری کھائی میں پھینک دیا۔میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔فضا دھوئیں سے بھری محسوس ہوئی۔میری سانسیں رکنے لگیں۔غصے اور نفرت کی تیز لہر میرے پورے وجود میں اُٹھی۔

''تم سب سالے ہیجڑے ہو۔سماجی ہیجڑے۔سیاسی ہیجڑے۔ہا۔ہا۔ہا۔تم نے ایک ہیجڑے کو رد کیا ہے۔میں ہزار ہیجڑے تم میں سے پیدا کروں گا۔ہا۔ہا۔ہا۔یہاں سب ہیجڑے بیٹھے ہیں۔''میں نے تالی ٹھونکتے ہوئے کہا اور مڑ گیا۔میں اونچی آواز میں ٹھہا کہ لگاتا ہوا اور زور زور سے تالیاں بجاتا ہوا دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

''سنو''-----ان میں سے کسی نے مجھے پکارا

میں پلٹا اور سوالیہ نگاہوں سے پکارنے والے کو دیکھنے لگا۔

''ہم ہوٹل ہیرٹیج اِن میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔تم آج رات کمرہ نمبر 202 میں آ جانا۔''ایک غلیظ چہرے نے مکروہ آواز میں مسکراتے ہوئے کہا۔اس کی بات پہ باقی لوگ بھی مسکرانے لگے۔

میرے اندر آگ لگ گئی۔جو جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی چلی گئی۔کمرہ نمبر 202 ۔202۔۔۔202۔۔چلو ایک رات ہی ہے۔اس کی لذت بھی چکھ دیکھیں۔

اگلی صبح کمرہ نمبر 202 سے ایک کی بجائے دو لاشیں نکلیں۔اور اخبارات کی سرخیاں سلگ رہی تھیں

اسی پر بس نہیں ہے کہ بلکہ دور تک اسی طرح کی کربنا کیوں اور کشاکش کا سلسلہ چلا جاتا ہے اور محترمہ صدف اقبال اپنے افسانوں کے ذریعے ان کا تعاقب کرتی ہوئی دور تک چلی جاتی ہیں۔

ماخذو مراجع

☆ متروک نسلیں

☆ حکمت عملی

☆ بڈھا مرتا نہیں

www.urduchannel.in

مناجاتِ بیوہ اور ہمارا معاشرہ

ہمارا معاشرہ اور سماج، صدیوں سے آج تک اسی ڈگر پر چل رہا ہے جس پر اسے پہلے پہل چلایا گیا تھا۔یقیناً اس وقت دنیا کے سامنے تعلیمات، ہدایات اور نہج نہیں تھے مگر اس کے بعد تو کتنے طریقے، ازم اور ادیان من جانب اللہ نازل ہوئے، معاشرے کے سدھار کے لیے پیر، پیغمبر، رسول اور پیامبر آئے مگر سوائے چند کے، لوگوں کی اکثریت ایسی تھی جنھوں نے ان کی تعلیم کو گلے نہیں لگایا بلکہ باپ دادا کی روش پر ہی چلتے رہے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا جہنم زار بن گئی اور یہاں کے گلستانوں میں کانٹے بھر گئے۔انسانوں کی زندگی میں انسانوں نے ہی دکھ بھر دیے اور ان ہی کے ہاتھوں معصوم انسانوں کی جان سولی پر لٹکتی رہی۔بالخصوص عورتوں پر تو مظالم کی انتہا ہی کر دی گئی، ماضی سے لے کر آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔

اب تو اس صورت حال پر افسوس کرنے والے بھی نہیں رہے۔ایک دور تھا جب کچھ لوگ باقی تھے جہاں میں اور انھوں نے اس صورت حال پر نہ صرف افسوس کیا بلکہ مقدور بھر اس کے خاتمے اور بدلاؤ کی کوششیں بھی کیں۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی پانی پتی ایک ایسے ہی شخص تھے جو علی گڑھ تحریک کے ایک اہم

ستون اور سرسید احمد خان کے مصاحب خاص تھے۔انھوں نے اس درد کو خاص طور سے محسوس کیا۔ان کی نظر معاشرے کی ان قباحتوں پر زیادہ پڑی جنھوں نے انسانی زندگی کو گھناؤ نا بنا دیا تھا۔یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں عورت کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہ تھی۔معاشرے میں اس کا کوئی مقام نہ تھا۔عورت دکھی اور مظلوم تھی۔اس کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔اس کے لیے حقوق نہ تھے۔حالی نے صدیوں سے ظلم کی چکی میں پستی ہوئی عورت کے درد کو محسوس کر کے اس کے حق میں آواز اٹھائی اور اس پر ہونے والی زیادتیوں، بربریت ومظالم کے خلاف آواز اٹھا کر بزعم خود طاقت کے نشے میں چور مردوں اور ان وضع دار خاندانوں کو آئینہ دکھایا جنھیں لگتا تھا کہ وہ دنیا کے منتخب لوگ ہیں۔حالؔی کی 1886 میں لکھی گئی معرکۃ الآرا نظم 'مُناجات بیوہ' اس کا ادنیٰ سا اظہار ہے۔'مُناجات بیوہ' ایک ایسی عورت کی خدا کے حضور کی گئی فریاد ہے جس میں وہ زمانے، اپنوں اور عزیزوں، سماج اور رواج کے مظالم کا شکوہ اللہ پاک سے حسن ادب سے کرتی ہے، اس کا جرم بس یہ ہے کہ وہ 'نوعمری' میں ہی بیوہ ہوگئی، جیسے یہ اس کا اپنا قصور ہو۔مگر وضع داروں کو اس سے کیا غرض! وہ تو یہی کہتے تھے کہ 'یہ بہو نہیں، ڈائن ہمارے گھر آ گئی اور ہمارے بیٹے کو کھا گئی۔اس نے آ کر ہمارے گھر میں تباہی مچادی۔یہ منحوس ہے۔' یہ جملے نہیں بلکہ کسی معصوم کے دل کی زمین پر گرنے والے وہ ایٹم بم ہیں جن سے اس کا پورا وجود ہی لرزہ بر اندام ہو جاتا ہے۔ایسی لڑکیوں کو میکے والے بھی نہیں چاہتے، یا پہلے جیسی مروت کا برتاؤ نہیں کرتے۔'مناجات بیوہ' کے اشعار یہی بیان کرتے ہیں۔عین ممکن ہے کہ یہ حالؔی کی اپنی ایجاد ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ انھوں نے کہیں کسی معصوم پر اس طرح کی قیامتیں گرتی دیکھی ہوں گی اور 'مُناجات بیوہ' جیسا شاہ کار وجود میں آ گیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں صالحہ عابد حسین کے ایسے ہی خیالات کا اظہار کروں:

''مجھے 'مُناجاتِ بیوہ' پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حالی باوجود مرد ہونے کے ایسا درد آشنا،

www.urduchannel.in

حساس، اتنا نازک دل کہاں سے لائے جس نے کم سِن بدنصیب بیوہ عورتوں کے صحیح جذبات واحساسات کو اس طرح محسوس کیا جیسے یہ سب کچھ خود ان پر بیتا ہو۔اس نظم کا سنسکرت سمیت ہندوستان کی دس بارہ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔مجھے یقین ہے کہ یہ نظم ہر ایک زبان میں اتنی ہی مقبول ہوئی ہوگی جتنی اردو میں ہوئی۔اس لیے کہ بیوہ عورت کی جو حالت اس میں دکھائی گئی ہے وہ ہندوستان کے ہر حصے میں پائی جاتی ہے اور یہ درد ناک تصویر ہر جگہ کی بیوہ عورت کی حالت کا آئینہ ہے۔''(1)

''مُناجات بیوہ'' کے فنی محاسن کے باب میں بس اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ حالی نے اس نظم کے لیے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس سے زیادہ موزوں اور موثر طرزِ بیان اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔مگر اس سے بھی زیادہ اہم خوبی یہ ہے کہ حالؔی نے ایک سماج کی ٹھکرائی، مصیبت کی ماری، ستم زدہ بیوہ، جس کی دنیا میں نہ کہیں داد ہے نہ فریاد، سوائے اپنے پالن ہار کے، اس کی کیفیت کس خوبی سے بیان کی ہے۔اس بیوہ کی دعا کا ایک ایک لفظ اثر انگیز ہے سننے اور پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ایک شعر، شاعر کا دل چیر کر نکلا ہے اور قاری کے دل میں اترتا چلا جا گیا ہے۔ذرا آپ بھی تو پڑھیں:

اے مرے زور اور قدرت والے
حِکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تری دُکھیاری
دروازے کے تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن
جان پہ اپنی آپ اجیرن
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں

دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے
منھ میں بول نہیں ہیں اتنے

اوران اشعار کو پڑھ کر دلوں کا پگھلنا لازمی سا ہو جاتا ہے۔

سیلانی جب باغ میں آئے
پھول نہ تھے کھلنے ابھی پائے
پھول کِھلے جس وقت چمن میں
جا سوئے سیلانی بَن میں
پیت نہ تھی جب پایا پیتم
پیت ہوئی تو گنوایا پیتم

.....

گھر برکھا اور پیا بدیسی
آئیو برکھا کہیں نہ ایسی
شرط سے پہلے بازی ہاری
بیاہ ہوا اور رہی کنواری
خیر سے ہے بچپن کا رنڈاپا
دور پڑا ہے ابھی بڑھاپا
عمر ہے منزل تک پہنچانی
کاٹنی ہے بھرپور جوانی

www.urduchannel.in

اس معصوم بیوہ کی مناجات کا سب سے پرکشش پہلو یہ ہے کہ دوران شکایت میں بھی عقیدت واحترام کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار اس کا بیان ہیں:

دین سے ترے اے مرے مولا
سب ہیں نہال ادنیٰ و اعلیٰ
سب کو ترے انعام تھے شامل
میں ہی نہ تھی انعام کے قابل
گر کچھ آتا بانٹ میں میری
سب کچھ تھا سرکار میں تیری
پہروں میں سوچتی ہوں یہ جی میں
آئی تھی کیوں میں اس نگری میں
آن کے آخر میں نے کیا کیا
مجھ کو مِری قسمت نے کیا دیا
رہی اکیلی بھری سبھا میں
پیاسی رہی بہتی گنگا میں
آکے خوشی سی چیز نہ پائی
جیسی آئی ویسی نہ آئی

حالؔی نے 'مُناجات بیوہ' کے ذریعے حقوق نسواں، لڑکیوں کی تعلیم کی تائید اور ستی کی رسم کے خلاف آواز اٹھائی۔ چنانچہ مناجات بیوہ کے بعد انگریز حکومت نے کمسن لڑکیوں کی شادی پر پابندی لگائی۔ انگریزوں نے تو پابندی لگادی اور سمجھ گئے کہ بات ختم ہوگئی مگر بات تو

وہاں سے اور آگے بڑھی اور اب تک بڑھتی جا رہی ہے۔ پتا نہیں کون آئے گا جو ان معصوم عورتوں کے آنسوں پونچھے گا اور ان کے سروں پر اپنا ہاتھ رکھے گا.....! ہمارے معاشروں میں یہ برائی اب عام سے عام ہوتی جا رہی ہے۔ اب تو عورتوں پر مظالم کے ان طریقوں نے نام بھی دوسرے اپنا لیے، کہیں انا، کہیں جہیز اور کہیں عزت و ناموس.....نہ جانے کیا کیا نام ہیں۔ بس ایک عورت ہی رہ گئی جس پر یہ مصیبتیں ٹوٹتی ہیں۔

حالی کا منشا اس نظم کے ذریعے ان برائیوں کا خاتمہ اور بگڑی سوسائٹیوں کی اصلاح تھی، چنانچہ اس زمانے میں اس سے تبدیلی رونما ہوئی.....آج پھر اسی تبدیلی کی ضرورت ہے اور ایک دو حالی نہیں بلکہ متعدد حالیوں کی بھی جو ہمارے بد سے بدتر ہوتے جا رہے سماجوں اور معاشروں کی اصلاح کریں۔

مآخذ ومراجع :

اردو محفل فورم: اردو ویب۔ پاکستان

مناجات بیوہ۔ مطبوعہ پنجاب بک ڈپو، لاہور۔ پاکستان

ابن صفی کے زندہ جاوید کردار

ایک مکمل گفتگو

جب فلک برسوں پھرا اور سرگرداں رہا تب کہیں جا کے خاک کے پردے سے کچھ ایسے انسان نکلے جنھوں نے یوم ورود سے یوم رخصت تک، ایسے لاجواب کارنامے انجام دیے جن کے دم سے گلشن مہک رہے ہیں، پھولوں کی خوشبوئیں ان کے آگے ماند پڑ گئیں، سورج کی تمازت نے انھیں آگے بڑھ کر سلام کیے اور چاند کی رونق ان کے سامنے پھیکی پڑتی چلی گئی۔ افلاک وارضین ان کے دم سے جنت بن گئے۔ وہ ایسے تھے جنھوں نے زمین پر انمٹ نقوش چھوڑے اور آسمانوں پر زندہ کارنامے رقم کیے۔

ایسے ہی انسانوں میں سے ایک انسان (اسرار احمد اسرارؔ ناروی) ابن صفی۔ آمد (26 اپریل 1928) رخصت (26 جولائی 1980) کا نام اردو تاریخ کا ایسا نام ہے جس کی مثال دور دور تک نہیں ملتی۔ وہ اپنے سلسلے کے خود ہی بانی اور خود ہی خاتم تھے۔ نہ جانے قدرت نے ان میں کہاں سے اتنی صلاحیتیں پیدا کر دیں کہ وہ ایک ہی نشست میں قاری کو سارے عالم کی سیر کرا دیتے تھے۔ وہ اپنے ناولوں میں نادر و نایاب اور حیرت انگیز

سمندروں، بلند و بالا پہاڑوں، سائنسی آلات، مشینوں، تخریب کار انسانوں، تیسری دنیا کی شرارتوں، زمین دار اور خاندانی روؤسا کی بربادیوں اور بلیک میل کرنے والوں کو ان کے مفید و مضر اثرات سے واقف کراتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے جاندار، فکرمند، قوم، ملت اور ملک کے ہمدرد، ملک پر منڈلاتے خطروں سے لڑ جانے والے کرداروں کی بدولت بھی اپنے سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔

کہتے ہیں کوئی فن پارہ، تخلیق، تحریر اور خیال اس وقت تک تام اور مکمل نہیں کہلاتا جب تک اس میں زندگی کے مسائل کی ترجمانی نہ کی جائے اور ترجمانی اس وقت صحیح معنوں میں ہوتی ہے جب 'کرداروں' کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کردار جو معاشروں اور سماجوں کے مختلف النوع و پیشہ افراد ہوتے ہیں۔ کبھی تو ایسے کردار بھی ہوتے ہیں جن کا دور دور تک بھی کا زندگی سے واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ فرض کر لیے جاتے ہیں مگر ان سے بھی فن پارے حسین، معتبر اور کارآمد ہو جاتے ہیں۔

کرداروں کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب فلسفیٔ اعظم ارسطو سے پوچھا گیا کہ کسی بھی فن پارے، تخلیق، ادب، ڈرامہ وغیرہ کے لیے سب سے اہم کیا ہے؟ تو انھوں نے کہا تھا:

''پلاٹ اور کردار.... وہ بھی اعلا کردار۔ پلاٹ کے بنا تو کسی طرح بات بن جاتی ہے یا وہ کیسا بھی چل جاتا ہے مگر کرداروں کے بنا بات کسی طرح نہیں بنتی۔''

O کرداروں کے بغیر کوئی فن پارہ، ناول، افسانہ، کہانی اور داستان تو کجا عملی زندگی بھی ناقص و ناتمام رہتی ہے۔ کرداروں کے بغیر کوئی فن، سماج اور معاشرہ ایسا ہے جیسے بغیر روح کے خوب صورت جسم جسے سب مردہ اور بے جان کہتے ہیں۔ یعنی کردار کسی بھی فن کی روح اور

www.urduchannel.in

جان ہوتے ہیں اور جب ابن صفی، نابغۂ روزگار فن کار، لامثال فن کار، لاجواب تخلیق کار، مہنکتی تحریروں اور باوقار انداز کے مالک، ابن صفی کے کردار ہوں تو، کہنے ہی کیا۔ ان کے بغیر تو ساری دنیا ہی بے روح نظر آتی ہے۔ ابن صفی کے وہ کردار جن پر خود مجھے آج تک حقیقت کا گمان ہوتا ہے کیوں کہ ان کے نام ہمارے اپنے جیسے ہی نام ہیں۔ عمران۔ صفدر۔ تنویر۔ چوہان۔ خاور۔ ثریا۔ رحمان صاحب۔ فیاض۔ سلیمان۔ سر ولیڈی تنویر۔ کمال احمد فریدی۔ حمید۔ انور۔ رشیدہ۔ اکثر مستقل اور چند ایک شاہکار ناولوں طرح یادگار، مثبت و منفی اور ذہن سے چمٹ جانے والے کردار۔ ایک ایک کر کے گنتے جائیں کسی بھی طرح یہ نام اجنبی، غیر مانوس اور دیومالائی نہیں لگیں گے۔ اسی طرح کے تاثرات کا اظہار کا خیال کرتے ہوئے ایک جگہ نامور صحافی، حسن کمال اپنے مضمون ''وہ منظر یاد آتا ہے'' میں لکھتے ہیں:

''ابن صفی نے ہمیں (کرداروں کی) ایسی دنیا سے متعارف کرادایا تھا جو خیالی ہوتے ہوئے بھی حقیقی بن چکی تھی۔''

اسی طرح ''روزنامہ انقلاب'' ممبئی سے وابستہ قطب الدین شاہد اپنے مضمون ''ابن صفی کی کردار نگاری: ایک جائزہ'' میں لکھتے ہیں:

''ابن صفی کے کردار الف لیلوی نہیں بلکہ روزانہ کی بیٹھک کے ہم جلیس محسوس ہوتے ہیں۔ یہ کردار ہم سے تنہائی میں بھی گفتگو کرتے ہیں، گدگداتے اور مسکراتے بھی ہیں، بازاروں میں ہمارے اندر حلول کر کے چلتے ہیں۔ زبان سے ادا ہونے والے جملوں میں ان کے مکالمے عیاں ملتے ہیں، دوستوں سے مزاح کرنے میں ہماری تربیت کرتے ہیں۔''

اسی طرح روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد نے اپنی 26 جولائی 1980 کی اشاعت میں محمد بشیر الدین (لال ٹیکری۔ حیدرآباد) کے حوالے سے لکھا ہے:

''ابن صفی نے اپنے قلم سے فریدی، عمران اور حمید جیسے لازوال کردار تخلیق کیے اور

لطف تو یہ ہے کہ ان کرداروں کو انھوں نے صرف کسی ایک ناول میں استعمال نہیں کیا بلکہ مستقل طور پر اپنی تمام تحریروں میں کیا ہے۔ ہر جگہ کرداروں کی مخصوص انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔ کہیں بھی ایک دوسرے سے خلط ملط نہیں ہونے پاتا۔ یہ کردار کچھ ایسے جیتے جاگتے لگتے ہیں کہ پڑھنے والا ان میں کھو کر رہ جاتا اور ہر کردار اس کے ذہن پر گہری چھاپ چھوڑ جاتا۔''

O ابن صفی کے برعکس دوسرے مصنفین نے جو کردار استعمال کیے ہیں وہ ہمارے لیے اجنبی اور غیر مانوس ہیں۔ مشتری۔ مہ لقا۔ امبرین۔ صارم۔ نادرہ۔ مہوش۔ مہناز۔ انارکلی۔ ثمریں۔ افسوں۔ تزانیہ۔ بہرام۔ عمرو عیار۔ بے دام۔ ماہ رخ۔ تبریز۔ تاثیر۔ آباد۔ وغیرہ ایسے نام ہیں جن کا ہمارے معاشرے میں وجود ہی نہیں ہے اور یہ نام زبان پر بھی ثقیل ہیں۔

جناب حسن کمال ''وہ منظر یاد آتا ہے'' میں مزید لکھتے ہیں:

''.....فریدی اور حمید ہماری دنیا کے ہی نہیں ہمارے کنبے کے افراد تھے۔ جب انسپکٹر احمد کمال فریدی کو کرنل اور سارجنٹ حمید کو کیپٹن کے عہدوں کی ترقی دی گئی تو معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے ہی باپ چچا کو ترقی ملی ہے۔''

O یہ حقیقت ہے کہ ابن صفی کے کردار ہمارے ہی ہم نفس اور ہم نوا ہیں۔ جنھیں بلا تفریق مذہب وملت، رنگ ونسل، زبان وبیان، ملکی وغیر ملکی ہر ایک سے انسانیت کی بنیاد پر ہمدردی ہے۔ جنھیں شہر کا ماحول خراب کرنے والے اور انسانوں کے قاتل عناصر سے اتنی نفرت ہے جس کی انتہا نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان کے اندر جسارت، جرأت، ذہانت، شجاعت، ہمت، حوصلہ مندی، دیانت، امانت، انسانیت، احساس ذمے داری، ہوش مندی، حاضر دماغی اور عفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔ ان کی لغات میں سطحی عشق وعاشقی کے الفاظ نہیں تھے۔ ان کی غیرت وحیا کا عالم یہ تھا کہ دوشیزائیں بھی شرما جائیں۔ اگر کوئی صنف

www.urduchannel.in

نازک پر غلط نگاہ ڈالتا تو چاہے وہ ان کا ساتھی ہی کیوں نہ ہوتا ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ ان کرداروں کی ان نیک عادات کے بیان کے لیے کسی دلیل اور ثبوت کی ضرورت نہیں ہے، ابن صفی کے ناولوں کے ورق ورق میں ان کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی اس اعلا ترین خوبی پر ہائیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی) کی شعبہ اردو کی سربراہ کرسٹینا اوئسٹر ہیلڈ کہہ اٹھی تھیں:

''ابن صفی کی جس بات سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوں وہ یہ ہے کہ ان کے کردار 'فریدی اور عمران' کبھی کسی عورت کی جانب نگاہ بد پھیرتے نہیں دکھائی دیتے۔''

پروفیسر کرسٹنا کے ان جذبات کو ناول ''دوسری آنکھ'' اس اقتباس سے بھی تقویت ملتی ہے:

''اس نے محسوس کیا کہ لیڈی بہرام اس کے بہت قریب آ گئی ہے۔ پھر اس کا جسم اس کے شانے سے مس ہونے لگا۔

''ارے...ارے...تم کانپ کیوں رہے ہو؟'' لیڈی بہرام ہنس پڑی۔

''مم....میرا...سس...سر چکرا رہا ہے!'' عمران گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔

''بدھو....!''

''یقین کیجیے...ارے...ارے میں....گرا...مم...میں گگ...گرا!''

وہ جھومتا ہوا فرش پر آ گرا۔

لیڈی بہرام اسے جھنجھوڑ کر آوازیں دے رہی تھی۔

وہ رات اس نے بے ہوشی میں بسر کی تھی اور لیڈی بہرام سے اپنے لیے کبھی بے بسی کے کلمات سنے تھے اور کبھی گالیاں کھائی تھیں۔

اسے ہوش میں لانے کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ کبھی ناک میں بتی کرتی اور کبھی ایسی سخت قسم کی چٹکیاں لیتی کہ عمران کی بھنچی ہوئی آنکھوں میں تارے ناچ اٹھتے۔ لیکن نہ تو اسے چھینک ہی آئی تھی اور نہ ہی وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا یا ہی

تھا۔.....پھر تھک ہار کر لیڈی بہرام نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔

عمران کا یہ ڈھونگ اس لیے تھا کہ ایک عورت اس کے اس قدر قریب ہوگئی تھی کہ انتہا ہونے کو تھی ۔عمران نے محسوس کیا ہوگا کہ لیڈی بہرام کی گالیاں اور چٹکیاں جہنم کی تباکاریوں اور ہولناکیوں سے کم ہیں اس لیے دنیاوی عذاب جھیل کر آخرت کا ثواب حاصل کرنا چاہیے۔

اسی طرح ''پرنس وحشی'' میں حمید کی کیفیت دیکھیے !

''روم نمبر بارہ میں پہنچتے ہی اس کی عقل گدی سے خارج ہوگئی۔مغربی طرز کے ساز بج رہے تھے..... اور ڈیڑھ درجن نیم عریاں لڑکیاں چاروں طرف تھرکتی پھر رہی تھیں.....

''ارے باپ رے.....!'' حمید نے آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے اور چلتے چلتے رک کر اس طرح کانپنے لگا جیسے کوئی سردی کھایا ہوا بکری کا بچہ ہو.....ساتھ ہی وہ بڑبڑائے جا رہا تھا۔''اے خدا تو نے میرے باپ کے گناہ پچھلے سال ہی معاف کر دیے ہوں گے ۔اب میرے گناہ بھی معاف کر دے....ایکس کیوزمی پلیز.....مائی گاڈ!''

''کیا بکواس ہے!'' پرنس نے اس کا گریبان پکڑ کر جھٹکا دیا۔

''سردی لگ رہی ہے ..... یور ہائی نس !'' حمید ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔''ایسی جگہوں پر اکثر مجھے نمونیہ ہوگیا ہے!''

O وطن اور اہلیان وطن بلکہ پوری دنیا کی سلامتی اور حفاظت کے لیے وہ اس وقت بھی بیدار رہتے تھے جب لوگ اپنی بلند و بالا، عالی شان اور آسمانوں سے باتیں کرنے والی عمارتوں میں خواب خرگوش میں مست ہوتے تھے۔اس میں کسی کی خصوصیت نہیں ہے ابن صفی کا ہر کردار ایکس ٹو سے لیکر جیمسن تک ۔فریدی سے لے کر قاسم تک سب اسی جذبے سے سرشار تھے۔

www.urduchannel.in

O فرض سے آگاہی اور قومی سلامتی کے احساس اور کارناموں کے نمونے دیکھیے !

فریدی کو خبر ملتی کہ'' تارجام کی پہاڑیوں میں ملک کی تباہی کا خفیہ مشن بنایا جا رہا ہے ۔ روزانہ رات کو ایک روشنی کا مینار سا اٹھتا ہے....''بس فریدی اور اس کی ٹیم اس کا راز جاننے اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے کمر بستہ ہو جاتی ہے۔

دوسری جانب ایکس ٹو کو پتا چلتا کہ'' کچھ لوگ عوامی تفریح گاہ یا کلب میں بیٹھ کر شہر میں بدامنی کا منصوبہ بنا رہے ہیں ...''پھر وہ خود (بشکل عمران) اپنی پوری ٹیم کے ساتھ میدان میں نظر آتا ۔اور اس وقت تک دم نہ لیتا جب تک معاملہ آر پار نہیں ہو جاتا۔اس کے ماتحت بلیک زیرو۔صفدر۔خاور۔تنویر۔چوہان ۔جولیا۔صدیقی ۔ظفر اینڈ جیمسن ۔نعمانی (ناچاقیوں کے باوجود) ایک دوسرے کے معاون و مددگار بن کر سرفروشی کے لیے تیار نظر آتے ۔

O بخار، بیماری، حالات کوئی بھی شے ان کے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دینے والے عزائم کے سامنے نہیں آتی تھی ۔ایسے حالات میں بھی انھیں اپنے فرض کی ادائیگی کا شدت سے احساس ہوتا تھا۔چنانچہ''پرنس وحشی'' کا یہ اقتباس دیکھیے !

''دو دن نواب رشید الزماں کے محل میں قیام رہا۔وہیں فریدی کو بخار نے آدبوچا لیکن اس کے باجود بھی حمید کو اس کے حکم کے مطابق موجودہ سفر اختیار کرنا پڑا تھا۔روانگی کے وقت بخار کی شدت کی وجہ سے بار بار غفلت طاری ہو جاتی تھی مگر جب بھی ہوش آتا حمید کے کانوں میں یہی جملہ گونجتا۔''ہم پہلی چوکی کی طرف جا رہے ہیں یا نہیں؟''

O ''چالیس ایک باون''میں جب عمران فیاض کے دوست عدیل فہمی کے بھائی عقیل فہمی کو کیفر کردار تک پہنچاتا ہے تو فیاض کو اس کا بہت قلق ہوتا ہے۔اس وقت عمران اس سے کہتا ہے:

''نہ جانے کتنے ایسے گذرے ہیں جنھیں تم ویسا ہی سمجھتے رہے تھے.. پیارے فیاض...تم ایسے ویسے کے چکر میں نہ پڑو۔اگر تمہارا باپ بھی کوئی جرم کرے تو تم قطعی بھول جاؤ کہ تم

اسی کے نطفے سے ہو۔تم قانون کے محافظ ہو پیارے۔''

اسی طرح ایک جگہ ناول ''پتھر کا خون'' میں رحمان صاحب فیاض کی سرزنش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''تم فرض کی ادائیگی سے پیچھے ہٹ رہے ہو۔اگر عمران مجرم ہے تو وہ نہ تو رحمان کا بیٹا ہوسکتا ہے اور نہ تمہارا دوست۔سمجھے۔''

اسی طرح ناول ''عظیم حماقت'' میں جب فریدی کے ساتھیوں کو پتا چلتا ہے کہ ان کا ایک ساتھی انسپکٹر شاہد دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے تو وہ بے دریغ گولی مار کر اس کا قصہ پاک کر دیتے ہیں۔

کرنل فریدی کا وہ کارنامہ جو انھوں نے محض اٹھارہ سال کی عمر میں انجام دیا تھا کسی طرح بھلایا نہیں جاسکتا۔اس کا شہر میڈرڈ کا رئیس ترین اور مشہور شخص ڈان میگائرے بھی معترف تھا چنانچہ ناول ''زمین کے بادل'' میں وہ حمید کے سامنے اس نے پرجوش انداز میں وہ واقعہ پیش کیا جب وہ لندن میں زیرِتعلیم تھا اور وہاں کے ایک شراب خانے میں اچانک آگ لگ گئی۔میگائرے کے الفاظ میں شراب خانہ بارود خانہ بن گیا تھا اور لوگ چاروں طرف سے شعلوں میں گھر گئے تھے۔اس وقت فریدی ہی تھا جس نے اپنی جان پر کھیل کر شراب خانے کے اوپری حصے میں مقیم لوگوں کو فائر بریگیڈ اسکواڈ کی جانب سے لگائے گئے جال پر پھینکا۔سب سے آخر میں نیچے آنے والا آدمی فریدی ہی تھا۔اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تھی .....وہ بری طرح جھلس چکا تھا۔.....حمید میگائرے کا حسین اعتراف سن کر اپنے چیف کی عظمت کو غائبانہ سلام کرنے لگا۔

O ابن صفی کے کرداروں کے سربراہوں (فریدی۔عمران) کی خطرات کی بو سونگھنے کی عادت۔حالات سے باخبر اور دشمن کے وار سے ہوشیار رہنے نیز اپنے ماتحتوں سے برتاؤ۔

www.urduchannel.in

نوکروں پر حدود میں رہتے ہوئے شاہ خرچی۔ان سے شفقت،ان کا خیال،مساویت اور ان کی بک بک، جھک جھک،لاکھ سمجھانے کے باوجود اپنی حرکتوں سے باز نہ آنے کے باوجود شفقتوں کے نمونے ان کے ناولوں میں بکھرے پڑے ہیں۔عہد فتن میں یہ نادرو نایاب مثالیں ہیں۔فریدی نواب زادہ ہے۔اس کی جاہ وحشمت اور خاندانی پس منظر کا تذکرہ ابن صفی نے کئی ناولوں میں بالتفصیل کیا ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ آدھی دنیا کو خرید لے اس کے باوجود قانون کی بالادستی اور حق کی بلندی کے لیے قانون کا محافظ بننا اس سے بھی زیادہ حمید پر اس کا شفقتوں،عنایتوں اور نوازشوں کی برسات کرنا بذات خود عظیم کارنامہ ہے۔فریدی حمید کو اپنے بھائیوں،بیٹوں اور دوستوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔بارہا ایسا ہوتا ہے کہ وہ حمید کی شرارتوں سے تنگ آکر اسے گھر سے نکل جانے کی دھمکی دیتا ہے،مگر حمید اسے ہنس کر ٹال دیتا ہے۔جیسا وہ ''سیاہ پوش'' لٹیرا میں کرتا ہے۔فریدی اس کی بک بک اور اوٹ پٹانگ سوالوں سے تنگ آکر کہتا ہے:

''بھاگ جاؤ سور!''

حمید جھک کر میزوں اور کرسیوں کے نیچے دیکھنے لگا۔پھر سیدھا کھڑا ہو کر مایوسانہ انداز میں سر ہلاتا ہوا بولا:

''شاید بھاگ گیا سور!''

فریدی بڑبڑاتا ہوا لائبریری سے چلا گیا۔اس کے ساتھ حمید بھی باہر نکلا۔

کبھی کبھی حمید فریدی کے ''نکل جانے'' والی دھمکی پر عمل کرنے کے لیے اٹھنے کی کوشش کرتا تو فریدی اپنی تمام مصروفیتیں چھوڑ کر اسے گلے لگالیتا۔

O ایسا نہیں تھا کہ حمید ہمیشہ شرارتیں ہی کرتا تھا اور بالکل ناکارہ انسان تھا۔حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی تو وہ فریدی سے بھی دو قدم آگے نکل جاتا۔خطرات کے وقت میں فریدی

کا سایہ بنا رہتا تھا اور اس کی دلی تمنا ہوتی تھی کہ چیف کی جانب آنے والی ہر گولی پہلے اس کا سینہ چھلنی کرے۔ فریدی کی ذارسی تکلیف پر وہ بلبلا اٹھتا تھا۔ ناول ''عظیم حماقت'' میں جب اسے پتا چلتا ہے کہ فریدی پر حملہ ہوا ہے تو اس کی وارفتگی ملاحظہ کیجیے:

''دوسری طرف سے سارجنٹ شاہد کی آواز سنائی دی۔ فوراً ایئر پورٹ پہنچئے۔ کسی نے فائر کر کے کرنل صاحب کو زخمی کر دیا ہے!''

''کیا بکواس ہے؟'' حمید بوکھلا کر بولا۔

''گولی بائیں بازو میں لگی ہے!''

''خدا کی پناہ۔ میں پہنچ رہا ہوں!'' حمید نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہ رہ سکے گا۔''

دو چار مواقع تو ایسے بھی آئے کہ حمید کی بدولت ہی فریدی کو نئی زندگی ملی۔ یہی وجہ تھی کہ فریدی اسے اس کی تمام تر نااہلیوں، شرارتوں، بچکانہ حرکات اور مسخرے پن سمیت جاں سے عزیز رکھتا تھا۔ اس نے کبھی حمید پر یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ مال و دولت، رتبے، عہدے، عمر یا کسی چیز میں بڑا ہے۔ حمید کو بھی اس کا احساس تھا۔ وہ اکثر دونوں زندگی کے مسائل پر بحث کرتے کرتے آداب سے پار ہو جاتے مگر اس وقت بھی 'آپ اور تم'' کا فرق باقی رہتا۔ حمید کبھی کبھی تو فریدی کو مشورے بھی دینے لگتا اور فریدی مسکرا کر سنتا رہتا۔ ناول ''مونچھ مونڈنے والی'' میں حمید خم ٹھونک کر فریدی سے کہتا ہے:

''فریدی صاحب! یہ دنیا محض فلسفہ اور منطق ہی نہیں ہے کبھی ریاضی کے بندھنوں سے نکل کر حمید خاں کی دنیا میں آیئے۔ اگر آپ جھنجھلا کر آنکھیں نہ پھوڑ ڈالیں، کان نہ اکھاڑ ڈالیں تو میرا ذمہ۔''

''شٹ اپ!'' فریدی انگڑائی لیتا ہوا بولا۔

''اس لیے کہتا ہوں شادی کر ڈالیے۔''

www.urduchannel.in

''چل بے!'' وہ حمید کو دھکا دیتا ہوا بولا۔

O حمید کی بات تو چھوڑیے فریدی معمولی نوکروں کے ساتھ بھی اسی طرح کا سلوک کرتا اور ان کے آرام کا خیال رکھتا تھا۔

عمران بھی کچھ کم نہیں تھا۔ ناول ''پیاسا سمندر'' میں اس کی جھلک ملتی ہے:

''وہ فلیٹ میں پہنچ گئے اور عمران نے کہا۔ ''تم بیٹھو میں کافی لاتا ہوں رات گئے نوکروں کو جگانا اچھا نہیں سمجھتا۔''

بسا اوقات سلیمان تک اسے بے وقوف بنا دیتا تھا۔ وہ اس کے سامنے کچن کے سامان کی فہرست اس طرح رکھتا جیسے وہ خود مالک ہو اور عمران اس کا نوکر۔ مگر عمران اس کی ایک ایک فرمائش سنجیدگی سے سنتا۔ اکثر سلیمان عمران کے قیمتی کپڑے۔ ٹائی، کوٹ یہاں تک کہ اس کے جوتے تک بھی وہ استعمال کر لیتا تھا۔ ناول ''دوسری آنکھ'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''پہلے تم مجھے یہ بتاؤ.... کیا دکھ ہے تمہیں!''

''اللہ کا فضل ہے... مجھے کوئی دکھ نہیں ہے.... البتہ میں سلیمان کے لیے بہت پریشان ہوں!''

''یہ کون ہے....؟''

''سخت نالائق ہے!''

''تم سے کیا رشتہ ہے....؟''

''ایک بار پھر اللہ کا فضل ہے کہ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے!''

''کیا بات ہوئی؟''

''وہ میرا ملازم ہے!''

''پھر بکواس شروع کر دی تم نے!' سر بہرام جھنجلا گیا۔

''یقین کیجیے! میرے سارے سوٹ تباہ کر دیے ہیں۔ میری عدم موجودگی میں انھیں

بے دریغ استعمال کرتا ہے!''

O سلیمان کی نالائقیوں کی یہ تو ہلکی سی جھلک ہے وہ اس سے بھی زیادہ نالائق تھا بلکہ بسا اوقات عمران کی ناک میں دم کر دیتا تھا اس کے باوجود کبھی عمران نے جو ایک اعلا تعلیم یافتہ اونچے خاندان سے تعلق رکھنے والا بلکہ شہر کے ڈائریکٹر جنرل آف پولیس کا صاحب زادہ ہونے کے باوجود اس پر بلکہ کسی پر بھی رعب نہیں جھاڑا تھا۔ چونکہ انسان تھا اس لیے کبھی کبھی کسی انہونی پر بھڑک جاتا اور نوکروں کی خبر لینے کی سوچتا کہ فیاض یا کسی مظلوم کا فون اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کر دیتا۔ فیاض کو جیسے تیسے رام کرتا تو مخصوص کمرے کے سگنل اسے اندر تک سے ہلا دیتے اور عمران ایکس ٹو بن کر اپنے ماتحتوں کو ہدایات دیتا یا ان کی ان کی رپورٹ حاصل کرتا۔ حالات کی سنگینی یا نزاکت دیکھ کر وہ سب کچھ بھول بھال کر ''کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر....'' کی رٹ لگاتا ہوا ملک دشمن عناصر کی سرکوبی کے لیے نکل پڑتا۔

O ابن صفی کے کردار اتنے بلند مقامات پر فائز ہونے کے باوجود اپنے متعلقین، دوست، احباب اور اپنے اہل خانہ کے دوستوں کو نہیں بھولتے تھے۔ اگر کہیں سر راہ ان سے ملاقات ہو جاتی تو اخلاقیات و آداب کے دریا ان کی خوش خلقی، آداب اور فیاضی پر شرما جاتے تھے۔ اگر وہ کبھی اس وقت یاد کریں جب عمران یا فریدی کیسوں کو سلجھانے میں مصروف ہوتے تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان کے پاس چلے آتے۔ اسے انسانیت اور قدروں کی معراج کہتے ہیں جس کا ان دنوں بہت تیزی سے فقدان ہوتا جا رہا ہے۔

O ابن صفی کے ان زندہ جاوید کرداروں کی عظیم خوبیاں اور بھی تھیں جنھوں نے انسانیت کے بڑے بڑے دعویداروں کو حیران کر دیا۔ وہ عیش و طرب اور نشاط کے مقامات پر جہاں خوش پوش جوڑے دنیا جہاں کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ فائیو اسٹار بلکہ آٹھ

www.urduchannel.in

ستارہ ہوٹلوں میں جہاں شراب اور منشیات کی ریل پیل ہوتی۔ رقص گاہوں میں جہاں اعلا طبقے کے لوگ مدہوش ہو کر ٹھمکے لگاتے ان مقامات پر یہ عفیف، دوشیزاؤں سے زیادہ شرمیلے، شراب جیسی ام الخبائث لعنت سے سخت متنفر؛ صرف ٹھنڈے پانی پر اکتفا کرتے تھے۔ شراب سے متعلق ان کے نظریے کا اندازہ ''دوسری آنکھ'' کے اس مکالمے سے لگایا جا سکتا ہے:

''تم نے بتایا نہیں کہ رات میں کون سی پیتے ہو؟''

''بھینس والی''

''کیا مطلب!''

''ڈیڑھ پاؤ گرم دودھ پی کر سو جاتا ہوں!''

''احمق'' وہ مسکرائی۔

''کیا سچ مچ نہیں پیتے...؟''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔

''بڑی عجیب بات ہے!''

میری دانست میں تو پینا ہی بڑی عجیب بات ہے!''

''کیوں؟''

''اچھے بھلے آدمی کی مدہوشی۔ مدہوشی جو خود اپنے اوپر مسلط کی جائے حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔''

اسی طرح ناول ''کنگ چانگ'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

'مجھے بھجوا دیجیے جوزف کے ساتھ تا بیسی جنت ہے یور مجسٹی''

''کیوں کفر بکتا ہے؟ جہاں لوگ دن رات نشے میں رہتے ہوں وہ جنت کیسے ہو سکتی؟''

''مم.....میں نے مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں کہا تھا۔''

''میں محاورتاً بھی ایسی بات سننا نہیں چاہتا۔''

''مورثی ہوس'' میں جب حمید بے ہوش ہو جاتا ہے اور ناصر و شاہدا سے برانڈی پلانے کا منصوبہ بناتے ہیں تو اس وقت قاسم کہتا ہے:

''نام بھی مت لینا....ورنہ ہوش میں آتے ہی مجھے قتل کر دے گا!''

''میں نہیں سمجھا؟''

''کہتا ہے کہ گدھی کا پیشاب، شراب سے افضل ہے۔ جب گدھی کا پیشاب نہیں پیتا تو شراب کیوں پیوں؟''

O ابن صفی کے یہ تمام کردار عام انسانوں کے جیسے ہونے کے باجود اپنے وقت کے انسانوں سے بلند قد و قامت، بلند آہنگ، عادات و اطوار میں سب سے جدا، معاملات فہمی میں سب سے انوکھے اور یگانہ تھے۔ وہ منفی ہوں یا مثبت، قانون ساز ہوں یا قانون شکن، اچھے ہیں تو اچھائی کی بلندیوں پر براجمان ہیں اور اگر برے ہیں تو برائیاں ان پر ختم ہوتی ہیں۔ اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جناب افضال احمد اپنے مضمون ''ابن صفی'' میں تحریر کرتے ہیں:

''(اگر) غور کریں تو آپ کو ابن صفی کے تمام کرداروں میں ایک خاص بات نظر آئے گی۔ وہ سب کے سب عام قامت انسانی سے بڑھ کر ہیں۔ ذہین تو ایسے کہ روئے زمین پر ان کا کوئی جواب نہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ قیامت ہے۔ ایک فتنہ ہے۔ وہ عمران و حمید ہوں کہ فریدی و لیونارڈ، سنگ ہی ہو کہ تھریسا بمل بی۔ سب ذہانت میں عام انسانوں سے سوا ہیں۔ اور اگر یہ نیک ہیں تو پھر یہ فریدی، حمید و عمران ہیں۔ برے ہیں تو وہ بھی نہایت بلند قامت ہیں۔ سنگ ہی تھریسا بمل بی شیطانی مخلوق کی علامت ہیں۔ ان دو اقسام کے دیو قامت کرداروں کے درمیان چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی کی ازلی آویزش جاری رہتی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ یہ کردار عام انسانوں سے ملتے جلتے ہونے کے باجود عام انسانوں کے

www.urduchannel.in

مقابلے زیادہ بلند و بالا اور بلند آہنگ ہیں۔''

O وہ کلبوں کی سرگرمیوں کو دور سے ہی دیکھتے بلکہ اکثر تو کسی مجرم کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں آتے تھے۔ پھر جوں ہی انھیں مجرم کے باہر نکلنے کا احساس ہوتا کھانا تک چھوڑ کر اس کا تعاقب کرنے لگتے۔ ان کے قدم نہ طوفانی رات روکتی اور نہ ہی سنگینوں کی باڑھ۔ نہ انھیں آگے پیچھے جانے آنے والی گاڑیوں سے پھینکے جانے والے گرینڈ مرعوب کرتے اور نہ ہی پہاڑوں کی بلندیاں ان کے پیر جکڑتی۔ اس کی شہادت کے لیے ناول ''ریت کا دیوتا'' کا وہ منظر ملاحظہ کیجیے جس میں فریدی۔ حمید شاہدہ فاروقی کو سعد آباد لے جاتے ہیں تو راستے میں تعاقب کرنے والی گاڑی سے ان پر مسلسل گرینڈ پھینکے جاتے ہیں مگر وہ اس آتشی بارش سے مرعب ہوئے بنا صاف بچ نکلتے ہیں۔

O انھیں عام انسانوں کی طرح اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں برتری اور کمتری کا بھی احساس ہوتا تھا۔ مثلاً جب وہ کوئی اچھا کام کرتے تو انھیں لگتا کہ ان کے مداح خوش اور دشمن جل بھن گئے ہوں گے اسی طرح جب کبھی ناکامی ان کا مقدر بنتی تو انھیں لگتا کہ ان کے دوست غمزدہ اور دشمن ہنس رہے ہیں۔ ناول ''پرنس وحشی'' میں حمید کی اسی طرح کیفیت ملاحظہ کیجیے:

''.....وہ بہت شدت سے بور تھا کیونکہ کچھ ہی دیر پہلے اس نے ملک کے سب سے زیادہ چھپنے والے روزنامے میں ایک خبر دیکھی تھی....اپنی اور جگدیش کی داستان...تصویروں کے پیکٹ کی کہانی جو اس کی جیب سے کوئی بہت ہی چالاک اور طاقت ور انسان نکال لے گیا تھا۔ کلیجہ خون ہو گیا اپنا نام دیکھ کر...کیا سوچا ہوگا ان لڑکیوں نے جو اسے کسی فلمی ہیرو کی طرح عزیز رکھتی تھیں....گرلز فرینڈ جو اسے کسی تفریح گاہ میں داخل ہوتے دیکھ کر اپنے ساتھیوں کی میزوں سے اٹھ جایا کرتی تھیں۔ کیا سوچ رہی ہوں گی اس کے بارے

میں....وہ سوچتا رہا اور بور ہوتا رہا۔

ایک مقام پر ناول ''کالی تصویر'' میں فیاض کو بھی نیچا دکھنے کا گمان ہوتا ہے۔اقتباس ملاحظہ کیجیے!

''کچھ دیر بعد عمران بھی وہاں پہنچ گیا۔فیاض نے اسے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔''بڑی مصیبت یہ ہے کہ یہاں کئی پولیس آفیسر بھی موجود ہیں۔انھوں نے مجھے بھی دیکھا ہے۔اگر اس کیس کے سلسلے میں ....میں کچھ نہیں کر سکا تو خواہ مخواہ آنکھیں نیچی ہوں گی۔''

O اسی طرح کے اور بھی حقائق ہیں جن کے نمونے ابن صفی کے ناولوں میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔دو ایک نہیں جنھیں تو بطور مثال پیش کیا جائے بلکہ ورق ورق ان سے معمور ہے۔وہ مافوق الفطرت عناصر سے بھی ڈرتے تھے۔عظیم شاہ کار ناول ''شاہی نقارہ'' میں فریب کار ''ہیروں کے تخت'' کے حصول کے لیے کس طرح کی فریب کاری کرتے ہیں۔یدھ راج گڑھی میں ناچتی کھوپڑیوں کا کھڑاگ پھیلاتے ہیں۔ڈاکٹر بھٹناگر اپنے گرگوں کو قدیم رومنوں کا لباس فراہم کر کے ''شاہی نقارے'' کی چوری کا منصوبہ بناتا ہے اور نواب صولت مرزا کی بیٹی جمیلہ پر سحر کاری کرتا ہے جس کے زیر اثر وہ نہ جانے کون سی دنیا کی باتیں کرتی رہتی ہے اور سادہ لوح گاؤں والے دہشت زدہ ہو کر اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔دوسری جانب ''کتے کے رونے'' کی آواز کا شاخسانہ پھیلا کر نیز گڑھی کی آسیب زدگی کا خوف دلا کر گاؤں والوں کو اس سے دور رکھا جاتا ہے۔حکیم ارسلانوس۔ دولت کا پجاری فلسفی رات دن اپنے مقصد کے حصول میں لگا رہتا ہے مگر باطل کے مقابلے حق غالب آتا ہے۔فریدی ان حالات میں چٹانوں کی مانند مضبوط نظر آتا ہے۔حمید کو بھی حوصلہ دیتا ہے اور نواب صولت مرزا کو بھی تسلیاں دیتا ہے۔پورے عملے کو قابو میں رکھتا

www.urduchannel.in

ہے اور خود کے بھی حواس بجا رکھتا ہے۔اس کے بعد فریدی اور حمید بادلوں سے ڈھکے اس راز کا پردہ فاش کر کے حقائق کا سورج سب کے سامنے لا کر رکھ دیتے ہیں اور مجرموں کو زمین کی سات تہوں سے بھی باہر نکال لاتے ہیں۔

O ابن صفی کے زندہ جاوید کرداروں میں اپنے بڑوں کو تنگ کرنے کی حسیں بھی تھیں۔ چنانچہ حمید فریدی کی ناک میں دم کر دیتا اور عمران سر سلطان، رحمان صاحب، ڈپٹی ڈائریکٹر فیاض، ثریا، اپنے بہنوئی ڈاکٹر خالد، لیڈی تنویر، سر تنویر، ایسے کتنے ہی نام ہیں جن کی اعلا طبقی کے باوجود وہ ان سے بھی مذاق کرتا، ان کے ساتھ حماقتیں کرتا اور اکثر اتنا سنجیدہ ہو جاتا ہے جیسے کسی مملکت کا سربراہ ہو۔مجرموں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالتے وقت اس کے چہرے پر بلا کی سفاکی نظر آتی تھی۔پھر جیسے ہی مجرم کو انتظامیہ کی تحویل میں دیتا حماقتیں پھر چہرے پر ڈیرا جما لیتیں۔اس وقت وہ دنیا کا احمق ترین انسان نظر آتا تھا۔اسی طرح فریدی اس وقت ڈراؤنا بن جاتا جب اس کے ہاتھ مجرم کی گردن پر پڑتے۔اس سے پہلے وہ اتنا محتاط ہوتا جیسے ریت پر چل رہا ہو اور اس کی ذرا سی بے خیالی سے مجرم ہوشیار ہو جائے گا۔

O فریدی اور عمران کے علاوہ ابن صفی کے یہ کردار بھی قارئین کے ذہنوں سے چمٹ کر رہ جاتے ہیں: سر سلطان، طاہر صاحب (بلیک زیرو۔ایکس ٹو کا نائب) استاذ محبوب نرالے عالم، انور۔رشیدہ، جولیا، روشی، فریدی کے دوسرے اسسٹنٹ انسپکٹر جگدیش، انسپکٹر ونود، لیڈی انسپکٹر ریکھا، ظفر اینڈ جیمسن، قاسم، قاسم کی بیوی، مسٹر عاصم (عاصم ملٹی انڈسٹریز کے مالک) اسی طرح کے اور بھی نام ہیں جن کا ذکر ابن صفی کے ناولوں میں درج ہے وہ نہ صرف زندگی کی علامت تھے بلکہ انسانوں کے درمیان فرشتوں کا کردار نبھاتے تھے اور جرائم سے پاک معاشرے کی تشکیل میں مصروف رہتے تھے۔کچھ لوگ وہ تھے جن کے ناموں سے

ہی ان کی شقاوت قلبی اور سفاکیت کا مظاہرہ ہوتا تھا: سنگ ہی، تھریسیا (ٹی تھری بی) ہمبنگ دی گریٹ، جیرالڈ شاستری حکیم ارسلانوس، ڈاکٹر نارنگ، ڈاکٹر چنگیزی، ڈاکٹر بھٹناگر ایسے ہی بہت سے ملک دشمن عناصر، نفرت کے سوداگر اور غداران وطن ہیں جن کے شر سے معاشرے، ملک اور عوام تھراتے تھے مگر عمران اور فریدی نیز ان کے جانباز انھیں کسی بھی طرح اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیتے تھے۔

O مذکورہ بالا تمام انسانی خصلتوں، عادتوں، مزاج، طرز زندگی اور معاشرت کے سبب ابن صفی کے ان کرداروں کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کسی اور دنیا سے تھے یا ان کا ہمارے معاشرے سے کوئی تعلق نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ آج تک ان کے عکس مٹائے نہیں مٹتے۔ یہ کردار حقیقت سے اتنے قریب تھے کہ دیکھتے دیکھتے کتنے ہی ابن صفی کے نقال پیدا ہو گئے جنھوں نے بشمول عمران۔ فریدی کئی کرداروں پر طبع آزمائی کی۔ کچھ دنوں تک ان کی جعل سازی چلتی بھی رہی مگر بہت جلد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔

O ابن صفی جس طرح اپنے فن میں یکتا و تنہا تھے اور کوئی ان کے ہم پلہ نہیں تھا اسی طرح ان کے کردار بھی سب سے سب سے جدا اور کھاتے پیتے انسان تھے۔ حالانکہ اس وقت ایک ابن صفی ہی نہیں بلکہ مصنفین کی ایک بڑی جماعت موجود تھی مگر سب مٹ گئے اور ابن صفی اپنے کرداروں کی طرح آج بھی زندہ ہیں۔

O کیا کوئی سر سلطان، عمران مع ٹیم۔ فیاض، رحمان صاحب، ثریا، سلیمان، جوزف، گلرخ، دوسری جانب فریدی کے ڈی آئی جی۔ فریدی۔ حمید، انور۔ رشیدہ، لیڈی انسپکٹر ریکھا جیسے کرداروں کو غیر مانوس کہہ سکتا ہے؟ کیا انھیں دائرۂ انسانیت سے خارج کیا سکتا ہے؟

یہ ایسے کردار ہیں جو قاری کے ذہن سے چپک جاتے ہیں اور ان کی حرکات، ہدایات،

www.urduchannel.in

جرائم کے تئیں جذبۂ نفرت، آپسی اٹھکیلیاں۔ ایک ایک بات جانی پہچانی سی لگتی ہے۔ اس وقت تو انتہا ہو جاتی ہے جب ابن صفی کا قاری ان سے محبت کرتے ہوئے ان کے ڈائیلاگ، فقروں اور جملوں کو عملی زندگی میں استعمال کرتا ہے اور ان کی پاکیزہ خصلتوں کو خود میں محسوس کرتا ہے۔ بلکہ انھیں اپنا آئیڈیل بنانے کی آرزو کرتا ہے۔ ان جیسا بننے کی تمنا کرتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید احمد قادری اسی طرح کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''.....ان ساری خوبیوں نے مجھے کرنل فریدی کا فین بنا دیا اور شعوری لاشعوری طور پر میں خود کو ان کی شخصیت میں ڈھالنے لگا.....(میں) سوچا کرتا کہ میں بڑا ہو کر کرنل فریدی بنوں گا اور ملک و قوم اور سوسائٹی کے کوڑھ کو ان کے کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔''

ابن صفی کا قاری ان کے کرداروں کے طرز پر جرائم سے نفرت اور امن سے محبت کرتا ہے۔ ان کے نظام کو معاشرے میں نافذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ قاری کو ایسا بھی محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ان سے کہیں مل چکا ہو یا اس نے انھیں کہیں دیکھا ہو اور ان سے ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جناب منظر مہدی فیض آبادی اپنے ایک مضمون ''ابن صفی: مقبولیت جن کی دشمن بن گئی'' میں اسی طرح کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''.....(جب ہم) ابن صفی کو پڑھنے بیٹھتے تو عمران اور فریدی کی گفتگو اس اس طرح ہوتی جیسے یہ زندہ کردار ہیں اور کہیں ان سے ملاقات بھی ہو سکتی ہے۔''

اسی طرح آج بھی ایسے بہت سے ابن صفی کے قارئین ہیں جو خود کو عمران، فریدی، حمید، سر سلطان اور فیاض تصور کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو صرف ابن صفی کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ان سے قبل یہ خوبی مرزا ہادی رسوؔا کے یہاں موجود تھی۔ امراؤ جان اداؔ ان کا ایسا ہی کردار ہے جس کے لیے اہلیان علم کی دو جماعتیں ہمیشہ سے لڑتی آئی ہیں۔ ایک گروہ اسے حقیقت مانتا ہے اور دوسرا اسے رسوؔا کی ذہنی تخلیق۔ حقیقت کچھ بھی ہو، اتنا ضرور ہے کہ

رسوا ہوں یا ابن صفی ان کا اعلا مقصد حقیقی زندگی میں بے قرار انسان کے مسائل کو بیان کرنا اور ان کے درد کو ہلکا کرنا تھا جو امراؤ جان۔عمران۔فریدی جیسے زندہ کرداروں کے ذریعے ہی ممکن تھا۔وہ انھوں نے کیا اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہے۔

اعلا پائے کے مصنفین میں سے یہی دو مصنف ایسے ہیں جنھوں نے کرداروں کے لحاظ سے اپنی الگ راہ بنائی، حالانکہ وہ راستے دشوار گزار تھے۔کانٹے بھرے تھے ان میں مگر انھوں نے انھیں صاف کیا، آج وہ شاہراہ بن چکے ہیں جن سے ادب کی ترسیل کے کام لیے جارہے ہیں۔

کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ کھودے ہوئے کنویں سے پانی پینے سے بہتر ہے خود کھود کر پینا۔اس لیے کہ اس میں انسان کو محنت و مشقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ابن صفی نے اپنے معاصرین کے طرز پر کھودے ہوئے کنوؤں سے پانی پینے کے بجائے خود کنواں کھودا اور اس کا فیض عام کردیا۔

ذیل میں کچھ مزید شواہد و حقائق کے ذریعے ابن صفی کے زندہ کرداروں کا جائزہ پیش ہے:

O ابن صفی کے کرداروں کی زندگی کی علامت یہ ہے کہ جس طرح کسی نہ کسی انسان میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے اسی طرح ان میں بھی کمزوریاں تھیں۔''**عمران**'' کو ہی لے لیجیے۔وہ آسمانوں سے بھی لڑ جانے کا حوصلہ رکھتا تھا۔اس نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے مگر ''کتوں'' کو دیکھ کر اس کی روح فنا ہوجاتی تھی۔بسا اوقات وہ مجرم کی کوٹھی یا بنگلے میں اس لیے داخل نہیں ہوتا کہ وہاں کتے ہوتے تھے۔کبھی بھی لاعلمی کے سبب وہ ان کے نرغے میں پھنس بھی جاتا۔رہائی کے لیے لاکھ جتن کرتا یہاں تک کہ ان کی ''مادری زبان'' میں اپنی بے چارگی کا اظہار کرتا۔کچھ کتے تو بھوں بھوں سے کاؤں کاؤں کر کے اس

www.urduchannel.in

سے اتفاق کر لیتے مگر دبنگ قسم کے کتوں کے بات سمجھ میں نہیں آتی وہ یکبارگی حملہ کر دیتے اور عمران بے نیل و مرام اونچی اونچی دیواریں پھاندتا ہوا کوٹھیوں سے باہر آجاتا۔

''**فریدی**''جس کے سامنے پہاڑ بے حیثیت تھے۔مجرم اس کے سائے سے بھی بھاگتے تھے۔اس کا نام سن کر اپنے ٹھکانوں میں کانپتے تھے۔وہ فریدی جس کے دم سے جرائم کی دنیا میں زلزلہ آجاتا تھا۔''حمید''اس کی سب سے بڑی کمزوری تھا۔نااہل، ناکارہ، کھلنڈرہ، مسخرہ، جھکی اور نہ جانے کیا کیا حمید۔فریدی اس کے لیے ساری دنیا سے لڑ سکتا تھا۔اسے اس کی ناراضگی ایک پل بھی برداشت نہیں تھی۔جب کبھی وہ ناراض ہوجاتا تو فریدی اسے منانے کے لیے دنیا کے خزانے لٹا دیتا تھا۔وہ بیمار ہوتا تو فریدی کی تمنا ہوتی کہ میری عمر اسے لگ جائے۔

ناول''سانپوں کے مسیحا''میں اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔منظر یہ ہے کہ ڈاکٹر چنگیزی نیما کے کہنے اور فریدی کے اقرار پر بی راؤ (فریدی) پر حملہ کر کے تجربہ گاہ سے بھاگ جاتا ہے اور کسی خفیہ جگہ سے ڈائنامائٹ سے اڑاتا ہے تو حمید جان بچانے کے لیے باہر بھاگتا ہے مگر اچانک اسے''ڈبلی کیٹ'' کا خیال آتا ہے تو جذبہ انسانیت کے تحت واپس پلٹتا ہے اور اس کی بیلٹیں کھوتا ہے اچانک چھت کا ایک بڑا حصہ اس پر آپڑتا ہے اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتا۔حمید اس سے بری طرح زخمی ہوجاتا۔اس وقت فریدی کی بے قراری اور بے چینی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔پھر جیسے ہی تین دن بعد حمید کو ہوش آتا ہے تو فریدی کی جان میں جان آجاتی ہے۔اسے اطلاع ملتی ہے کہ حمید ہوش میں آگیا ہے تو تمام ضروری کام چھوڑ کر اسپتال دوڑا آتا ہے۔حمید کو صحت یاب دیکھ کر اپنی مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

''خدا کا شکر یہ ہے کہ تم خطرے سے باہر ہو.....''

''**حمید**'' کی کمزوری ہر خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ ان کے لیے کتا، بندر، لٹو، مسخرہ، دیوانہ، نہ جانے کیا کیا بن جاتا۔ یہ سب گورکھ دھندے وہ صرف ان کی قربت پانے کے لیے کرتا تھا۔ اس میں بدنیتی یا ہوس کا شائبہ تک نہ تھا۔ کیونکہ ابن صفی کے منجملہ تمام کرداروں کے جیسا تھا جنھیں حلال سے محبت اور حرام سے نفرت تھی۔

حمید کی ایک اور کمزوری سانپوں سے ڈرنا تھا۔ وہ اگر دور سے بھی سانپ دیکھ لیتا تو اس کی گھگی بندھ جاتی تھی۔ بالخصوص اندھیرے میں تو اس کی روح ہی فنا ہو جاتی تھی۔ بقول ابن صفی:

یہ اس کی بہت بڑی کمزوری تھی جس سے وہ بچپن سے اب تک پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا۔

''**قاسم**'' کی کمزوری اس کی موٹی عقل، موٹی عورتیں، کھانا اور ''چپاتی بیگم'' تھی۔ جسے وہ گلہری بھی کہتا تھا۔ کھانا تو اس کی زندگی تھا۔ اگر کسی دن کھانا نہ ملتا تو ساری دنیا اس کی نگاہوں میں بے رنگ اور بے مقصد ہو جاتی تھی۔ حالات کیسے بھی ہوں، آگ و خون کا ماحول ہو یا قیامت کا سماں، بھوک کے آگے قاسم کو کسی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ناول ''سینکڑوں ہم شکل'' میں جب ڈاکٹر دوبے کے ہم شکل قاسم کی کوٹھی میں آ آ کر ہلاک ہوتے ہیں اور پورے گھر میں افراتفری مچ جاتی ہے، ایسے ہوش ربا حالات میں بھی قاسم کو بھوک کا احساس رہتا ہے۔ چنانچہ وہ بھوک کی بے تابی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی بیوی سے کہتا ہے:

''ارے مرغئی ہو گی تمہاری بھوک! میری تو زندہ ہے.... خانا لگواؤ میز پر ورنہ میں تمہاری بوٹیاں تل کر کھاؤں غا! میرے ٹھینگے پر ہے لاش واش .....کیا میں اس سالے کو بلانے غیا تھا۔ کل بھی آ قر مر گیا.....آج بھی آ قر مر گیا.....واہ.....ایسی کی تیسی کوئی کب تک بھوکا رہے۔''

''**جولیا**'' کی کمزوری کا کروچ اور ایکس ٹو کا غرانا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ ایکس ٹو

www.urduchannel.in

کے فیصلوں کو چیلنج اور ان میں چوں چرا کرتی اس وقت ایکس ٹو کا غرانا اسے اندر تک سے ہلا دیتا تھا۔ ''جولیا اپنے کام سے کام رکھو، غیر ضروری باتیں نہیں!'' یہ ہدایت نہیں گویا ایٹم بم گرتا تھا اس کے سر پر۔ ....عمران بھی اس کی بہت بڑی کمزوری تھا۔ وہ اس کے قریب ہونے اور سمجھنے کے لیے نہ جانے کتنے جتن کرتی۔ اس کے غموں میں دکھی ہوتی۔ اس سے ہمدردی کرتی۔ اس کے لیے مٹ جانا چاہتی تھی حالانکہ وہ اس کے ساتھ اول درجے کے احمقوں جیسا سلوک کرتا تھا۔ سفاک عمران اسے صحیح معنوں میں منہ بھی نہ لگاتا تھا۔

عمران سے جولیا کی ہمدردی، عشق اور فنائیت کی ایک جھلک ناول ''دوسری آنکھ'' کے اس واقعے میں ملتی ہے جب عمران پرانی گاڑی خریدنے کے بعد شہر بھر میں بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ جولیا ایکس ٹو کو فون کر کے اسے عمران کے بھیک مانگنے کا حال بتاتی ہے تو دوسری جانب سے ایکس ٹو غراتا ہوا اسے مطلب سے مطلب رکھنے کی ہدایت دیتا ہوا چند گراں بار ہدایات دے کر سلسلہ منقطع کر دیتا ہے تو جولیا کہ منہ سے نکلتا ہے:

''جانور''

پھر وہ سوچنے لگتی ہے:

''اسے انسانیت چھو کر بھی نہیں گذری.....عمران نے اس کے لیے جو کارنامے انجام دیے تھے۔ ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں میں پھر گئے۔ کتنی بار وہ موت کے منہ میں گیا۔ ہو سکتا ہے اس کے لیے اسے معقول معاوضہ بھی ملا ہو لیکن پھر بھی.....ایسی بے مروتی .....یہ ایکس ٹو جانور ہے... پورا پورا جانور''

''**جوزف**'' کی کمزوری شراب اور توہم پرستی تھی۔ شراب وہ چاہے کوئی سا ہی میک ہو۔ پرتگالی ہو یا دیسی، افریقی ہو یا انگریزی، اطالوی ہو یا برطانوی وہ ہر ایک کو غٹا غٹ پی جاتا تھا بلکہ عمران اس کے لیے یومیہ چھے بوتلوں کا انتظام کرتا تھا وہی اس کے پیٹ کا جہنم

بھرتی تھیں۔اس کا کہنا تھا بلکہ سب کا مشاہدہ تھا کہ مشراب نہ ملنے کی صورت میں جب اس کا نشہ اکھڑتا تھا اس کی تمام صلاحیتیں، ذہنی سوجھ بوجھ، عملی طاقتیں اور دفاعی قوتیں سب ختم ہوجاتی تھیں اور اگر اسے شراب کی ایک گھونٹ بھی مل جاتی تو وہ رسیوں کو بھی توڑ دیتا تھا۔ ایک مرتبہ جب عمران نے اس کے شراب کے خرچ میں کمی کی تو اسے سلیمان کے ساتھ ناول ''رات کا بھکاری'' میں بھیک بھی مانگنی پڑے اور اونے پونے میں وہ اڈا فروخت بھی کر دیا۔

اوہام پرستی اور غیر مرئی طاقتوں سے ڈرنے میں تو جوزف کا جواب ہی نہیں تھا۔اس کے سامنے دنیا کے بڑے سے بڑے سائیکالوجسٹ کی دلیلیں بھی فیل ماہرین نفسیات اور حقیقت پسند ناکام۔عمران تو اکثر ماتھا پیٹ پیٹ ڈالتا تھا مگر جوزف کس قسم کا جانور تھا اسے آخر تک پتا نہ چل سکا۔عمران کے لیے اکثر اس کی اوہام پرستی دردسر بن جاتی اور مصیبتیں کھڑی کر دیتی، اسی پر ان کی گاج بھی گرتی تھی کیونکہ وہی اسے پالتا تھا پھر وہ اور کس کے سر پڑتا۔سب سے زیادہ ڈرا سے اپنی افریقی محبوبہ کی بددعا سے لگتا تھا جو اس نے تعلقات توڑتے وقت افریقہ کے جنگلوں میں پائے جانے والے خطرناک سانپ کے حوالے سے دی تھی۔

ناول ''تصویر کی اڑان'' میں نمایش میں پیش کردہ ایک پرندہ ''گھاؤنچ ببرا'' بن کر اس کے سر پر مسلط ہوجاتا ہے۔وہ اس کے خوف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور عمران سے بھی بزور اپنی تقلید کرنے کو کہتا ہے۔حالانکہ وہ سنہری تتلی کی ''تصویر'' ہوتی ہے جسے دیکھنے والوں کو دیکھنا چاہیے مگر جوزف کو کون سمجھائے جو اسے انتہائی منحوس پرندہ کہتا تھا بلکہ اس کی خواہش تو یہ تھی کہ عمران بھی ''گھاؤنچ ببرا'' کے سائے سے دور رہے۔اس کی حالت دیکھ کر پرندے کی تخلیق کار کریسٹن بھی چکرا کر رہ جاتی ہے۔''گھاؤنچ ببرا'' اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ لوگ اس کے شاہ کار کی اس طرح مٹی پلید کریں گے۔عمران جوزف کو لاکھ سمجھاتا ہے مگر وہ سمجھنے کے بجائے عمران سے بھی آنکھیں بند کرنے کو کہتا ہے۔اس وقت کے مکالمے ملاحظہ ہوں:

www.urduchannel.in

''جوزف'' دفعتہً جوان آدمی نے نیگرو کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔''گدھے...اگر میں بھی آنکھ بند کرلوں تو گھر کیسے پہنچیں گے؟''

''سنہری تتلی باس....اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔تم نہیں جانتے کہ گھاؤنچ ببر اموت کا قاصد ہے۔اپنے ساتھ آسمان سے برسنے والے تیر لاتا ہے۔''

''اواحمق...یہ تو تصویر ہے!''

''اس سے فرق نہیں پڑتا باس''

اسی طرح ناول ''آنکھ شعلہ بنی'' میں جوزف کی توہم پرستی ملاحظہ کیجیے:

''.....میں تو حیران رہ گیا۔اس نے پچھلے سال ایک ایسی عورت دیکھی تھی جس کا سر گدھے کا تھا!''

''ساری عورتیں ہی گدھے کا سر رکھتی ہیں!''

''مذاق نہیں باس۔اس نے صرف مٹوشی کا کو ہی دیکھا تھا۔وہ جو صرف پورے چاند کی رات کو چراگاہوں میں نمودار ہوتی ہے جب بھی دیکھی جاتی ہے ہیضہ پھیلتا ہے!''

''ابے میرے جوتے کہاں گئے؟''

''ہم میں سے جب بھی کوئی اس کا تذکرہ سنتا ہے ایک ہفتے تک ننگے پیر پھرتا ہے!''

''اچھا تو پھر؟'' عمران آنکھیں نکال کر بولا۔

''میں نے احتیاطاً جمعدار کو دے دیے!''

''اچھا!'' عمران منھ پھاڑ کر رہ گیا۔

''دیکھو باس۔میں بھی ننگے پیر ہوں۔میں اسے کسی طرح نہیں روک سکا کہ وہ مٹوشی کا کا تذکرہ نہ کرے!''

''مٹوشی کا کے بچے تو اس وقت اپنے گاؤں کے کسی کرال میں نہیں بلکہ رانا پیلیس میں ہے!''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا باس۔خبیث روحیں پل بھر میں نارتھ پول سے ساؤتھ

پول تک پہنچ سکتی ہیں!''

اقتباس طویل ہے۔ آخر میں عمران بے بسی سے منہ چلا کر رہ جاتا ہے اور ساری دنیا کو انگلیوں پر نچائے پھرنے والا عمران اس کے سامنے اپنے آپ کو بالکل الّو محسوس کرتا ہے۔

''**فیاض**'' کی کمزوری اسٹینوئیں تھیں، جنھیں وہ بقول عمران ''روز بدلتا تھا۔'' ابن صفی اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''فیاض کی حسن پرستی عمران پر اظہر من الشمس تھی وہ ہر دوسرے تیسرے دن اسٹینو بدلتا تھا۔''

فیاض کی اس عادت کے متعلق ایک مرتبہ ناول ''پتھر کا خون'' میں گرما گرم بحث بھی ہوگئی تھی جس میں فیاض کو ہی شکست کھانی پڑی۔ ایک اور کمزوری اس کا اپنی بیگم سے ڈرنا تھا۔ ان ہی کمزوریوں کے سبب وہ عمران کے ہاتھوں بار بار بلیک میل ہوا اور ایسے ایسے راز اگل دیے جو خاص محکمۂ سراغرسانی کے ''حقوق'' ہوتے تھے۔ عمران انھیں لے اڑتا اور اپنی ٹیم میں تیر مار خاں بن جاتا۔

''**لیڈی تنویر**'' کی کمزوری اس کی اصلیت کا ظاہر ہونا تھا یہی وجہ ہے کہ جب عمران نے روشی کی مصاحبت کی پاداش میں رحمان صاحب کی حویلی سے نکلنے کے بعد شہر میں ''طلاق سینٹر'' کھولا تو اس کی سب سے پہلی کسٹمر وہی بنی اور اس کے لیے انھوں نے معقول رقم بھی دی۔

''**انسپکٹر آصف**'' کی تمام کمزوریوں سے انور واقف تھا نیز ''وہ اسے محکمے کا سب سے بڑا رشوت خور کہتا تھا۔'' یہی وجہ ہے کہ اس کے نام سے وہ کانپ جاتا تھا۔ انور بھی اس کے اس ویک پوائنٹ کا خوب فائدہ اٹھاتا یہاں تک کہ وہ آصف کا نام لے کر وہاں بھی درانہ وار داخل ہو جاتا جہاں پولیس کے امتناعی احکام نافذ ہوتے۔ اس طرح اس کا مقصد فریدی کی مدد کرنا اور ''**اسٹار**'' کا پیٹ بھرنا ہوتا تھا۔

www.urduchannel.in

''**رشیدہ**'' جو کہ کرغال کی شہزادی تھی، اپنی اصلیت چھپانے کے لیے انور پر شاہ خرچی کرتی اور لاکھ ناگواری و جھگڑوں کے باوجود اس سے دوستی رکھتی تھی۔ وہ بھی ایسی کہ انور کو حقیقت کا احساس تک نہ ہو سکا۔

''**سنگ ھی**'' جو بیلوں کی طرح لپٹ جانے کا ملکہ رکھتا تھا۔ جب وہ مدمقابل سے چپٹتا تو اسے بے بس کر کے ہی دم لیتا۔ جونک کی تشبیہ اس پر صحیح صادق آتی ہے۔ حوصلہ مند، جانباز، جری ایسا کہ ہتھکڑیاں کھول کر پولیس کے نرغے سے نکل جاتا۔ اس کی بھی ایک کمزوری تھی۔ وہ اپنے ''**بھروپ اور مقابل**'' سے ڈرتا تھا۔ عمران اسے ہر بار ان ہی دونوں طریقوں سے زیر کرتا۔

''**تھریسیا**'' جو زیرولینڈ کی بے تاج بادشاہ یا رکن ہے اور اس کی تعمیر و توسیع کے مسلسل منصوبے بناتی رہتی ہے جس کے لیے وہ شہروں میں رہنے والے بے روزگاروں اور ٹوٹے پھوٹے انسانوں کو استعمال کرتی ہے۔ اس کی کمزوری عمران تھا۔ وہ عمران کی دشمن تھی مگر جذبہ دل دشمنی کو میٹھا سا رنگ دے دیتا تھا۔ وہ عمران کے آگے بچھ جاتی تھی ''پیاسا سمندر'' میں اس کے والہانہ قربان ہونے اور فنائیت کی ادائیں بہت خوب ہیں۔ وہ عمران کی بے رخی دیکھ کر ڈاکٹر داور کے تہہ خانے میں زہر کھا لیتی ہے۔ اس کی ایک اور کمزوری آواز نہ تبدیل کرنا تھی، اسی طرح وہ بدلی ہوئی آواز کو بھی نہیں پہچان سکتی تھی۔ عمران آوازیں تبدیل کر کے اس کے پاس پہنچ کر اسے ایسے ہی زیر کرتا تھا۔ مگر اس کے ''**حبس دم**'' کا ملکہ تو غضب کا تھا۔ اس وقت وہ مردہ، بے جان اور ٹھنڈ سے اکڑی لاش اور قابل رحم نظر آتی تھی۔ عالم یہ ہوتا کہ عمران تو کجا فریدی جیسا بشراشناس شخص بھی دھوکا کھا جاتا تھا۔ پھر جیسے ہی خطرہ ٹلتا وہ انگوٹھے دکھاتی ہوئی یہ جا وہ جا۔

اسی طرح اور بھی کردار ہیں جن میں کوئی نہ کوئی کمزوری تھی۔ کمزوریاں ہونا کوئی عیب

نہیں ہوتا یہ تو انسان زینت ہوتی ہیں اور انسان کی علامت۔ ابن صفی کے کرداروں میں یہ خوبیاں تھیں جو انھیں جیتا جاگتا اور زندہ انسان ثابت کرتی ہیں۔

O ابن صفی کے کرداروں کے حقیقی ہونے کی ایک واضح علامت یہ ہے کہ وہ مجرموں کو پکڑنے کے وہی طریقے استعمال کرتے تھے جو معروف اور رائج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ان سے غلطیاں بھی سرزد ہو جاتی تھیں اور مجرم صاف بچ نکلتا تھا۔

O وہ زندہ جاوید کردار مجرموں کے تئیں ہمدردی کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔ انھیں مجرم سے نہیں بلکہ جرم سے نفرت تھی چنانچہ ان کے ذریعے انجام دیے جانے والے جرائم پر تو ان کے دل رو پڑتے تھے۔ ناول ''خطرناک بوڑھا'' میں فریدی افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے:

''میں جب بھی کسی مجرم کو قانون کے حوالے کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ کیا اب ہمیں مجرموں سے پناہ مل جائے گی۔ کیا مجرموں کو سزا دینے سے وہ برائی مٹ جائے گی جس میں مبتلا ہو کر یہ پھانسی کے تختے کی طرف آتے ہیں۔ اب تک کروڑوں قاتل سزائے موت پا چکے ہوں گے لیکن کیا اب قتل نہیں ہوتے۔ کیا مجرموں کی تعداد کم ہو گئی ہے؟''

اسی طرح ''بے چارہ شہ زور'' میں عمران کہتا ہے:

''.....اس شخص کے لیے میرا دل رو رہا ہے۔ کاش اس کے انتقامی جذبے نے انفرادی رنگ اختیار کرنے کے بجائے ایسی تحریکوں کا ساتھ دیا ہوتا جو ظلم اور جبر کے نظام کو مٹا دینے کے لیے کام کر رہی ہیں!''

''خون کا دریا'' کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ کیجیے جس میں فریدی ڈاکٹر ضرغام جیسے جرائم پیشہ شخص کے حکومت کے ذریعے بچا لیے جانے پر افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے:

''بہر حال یہ میری پہلی شکست ہے۔''

''شکست کیوں؟'' ڈی آئی جی نے کہا: ''اگر حکومت بیچ میں نہ آجاتی تو تم نے سارے عقدے حل ہی کر لیے تھے۔''

www.urduchannel.in

''مجھے عقدوں سے زیادہ بے گناہوں کی جانوں کا خیال رہتا ہے۔ وہ غریب لڑکی بھی ماری گئی اور اتنا فضول خون بہا.....اس لیے کہ مجرم ایک بادشاہ ہے۔''

اس واقعے کے بعد فریدی عرصے تک غمگین رہا۔

اسی طرح کی ایک مثال ''خاص نمبر'' کے طور پر شائع ہونے والے ناول ''لاشوں کا آبشار'' کا وہ اقتباس ہے جس میں ڈاکٹر نارنگ اپنی اصلیت اور بچپن سے لے کر اب تک کے حالات اور زمانے کی ستم ظریفیوں کا انکشاف کرتا ہے اور انسانوں سے نفرت کی وجہ بتاتا ہے۔ اس وقت فریدی کے منہ سے نکلتا ہے:

''اگر یہ غلط راستے پر نہ نکل گیا ہوتا تو بڑا عظیم آدمی ہوتا؟''

اسی طرح وہ ''سانپوں کے مسیحا'' میں ڈاکٹر چنگیزی کے روح فرسا مظالم کا انکشاف کرنے کے دوران حمید کے ایک سوال کے جواب میں کہتا ہے:

''ہاں حمید صاحب! آدمی جب درندگی پر اتر آتا ہے تو جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی کتے کو دوسرے کتے کا گوشت کھاتے دیکھا ہے۔''

شاہ کار ناول ''خطرناک لاشیں'' کے اختتام پر کھلنڈرا اور بے فکرا عمران انسانوں کی تخریبی جدت، انسانیت کش ایجادات اور ان کی تباہ کاریوں پر ماتم کرتے ہوئے آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس ہیجانی وقت میں اس کے منہ سے اس طرح کے دردانگیز جملے نکلتے ہیں:

''میرا دل چاہتا ہے کہ یہیں سڑک پر ناچنا شروع کر دوں!''

''اگر آپ ایسا کر بیٹھے تو میں تو اسے دیوانگی کہوں گا عمران صاحب!''

''تم دیوانوں کی سی باتیں کر رہے ہو صفدر۔ اگر تمھیں کبھی کوئی ہوش مند آدمی مل جائے تو مجھے اس کے پتے سے ضرور آگاہ کرنا میں اسے کسی عجائب گھر میں رکھوا دوں گا تاکہ دیوانے اسے دیکھ کر محظوظ ہو سکیں۔ اگر میں سڑک پر ناچنا شروع کر دوں تو تم مجھے دیوانہ کہو گے لیکن لاشوں پر ناچنے والے سورما کہلاتے ہیں۔ انھیں اعزاز ملتے ہیں .....ان کی

چھاتیاں تمغوں سے سجائی جاتی ہیں!''

یہ کیفیات اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب سینوں میں حساس دل دھڑکتے ہیں اور یہی انسانیت وزندگی کی علامتیں ہیں۔اگر کوئی دل ''حس'' سے عاری ہو، معاشرتی برائیوں پر نہ روئے، ملک پر منڈلاتے خطرات کا ادراک نہ کرے اور دنیا کو تباہی کے دہانے لے جانے والی مشینوں، ایجادات، سوچوں اور منصوبوں پر ماتم نہ کرے وہ جن، پری، مافوق الفطرت حیوان یا کچھ اور تو ہوسکتا ہے انسان نہیں ہوسکتا۔

○ یہ خوبی بھی ابن صفی کے کرداروں کو جیتا جاگتا انسان ثابت کرے گی کہ ان میں ہنسنے ہنسانے، فلسفہ بگھارنے، مجرموں کے گناہوں پر افسوس کرنے، کلبوں، ہوٹلوں، پارکوں، بیچوں پر گھومنے، لانگ ڈرائنگ کرنے، اٹھکیلیاں کرنے، ساتھیوں کو دق کرنے اور انھیں نیچا دکھانے جیسی عادتیں موجود تھیں یہ ہی خوبیاں ایک انسان کامل میں پائی جاتی ہیں۔

○ وہ حالات کی سنگینوں، معاشرے کی بے راہ رویوں اور لوگوں کے تخریبی سوچ پر بھی بے لاگ تبصرے کیا کرتے تھے اور سلگتے مسایل کا حل بھی تلاش کرتے تھے۔ابن صفی نے ان کے ذریعے ایسی زرین باتیں کہلوائیں اگر ان کے عشر عشیر پر بھی عمل ہوجائے تو ہمارا معاشرہ سنور سکتا ہے۔یوں تو اس کی بہت سی مثالیں ہیں چنانچہ ''زہریلا سیارہ'' کا یہ اقتباس ملاحظ ہو:

''آخر یہ جرائم اتنے کیوں بڑھ گئے ہیں؟''

''جھلاہٹ کی بنا پر!'' فریدی بولا۔

''میں نہیں سمجھا جناب!''

''آبادی بڑھ گئی ہے۔وسائل بھی محدود ہیں اور چند ہاتھوں کا ان پر قبضہ ہے۔''

''جھلاہٹ والی بات تو رہ ہی گئی۔''

''اسی طرف آرہا ہوں....دولت مندوں کو مزید دولت مند بننے کی آزادی ہے۔عوام کو قناعت پسندی کا سبق پڑھایا جارہا ہے۔''

''اسی صورت میں اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے؟''

''چارہ ہی چارہ ہے۔اگر خودغرضی اور جاہ پسندی سے منہ موڑ لیا جائے۔ایک نئے انداز کی سرمایہ داری کی بنیاد ڈالنے کے بجائے خلوص نیت سے وہی کیا جائے جو کہا جاتا رہا ہے تو عوام کی جھلاہٹ رفع ہوجائے گی۔ضرورت ہے انھیں قناعت پسندی کا سبق پڑھانے کے بجائے ان کی 'خودی' کو ابھارا جائے، جیسے بعض دوسرے ملکوں میں ہوا ہے۔''

''ہولناک ویرانے'' کا مکالمہ دیکھیے!

''تھوڑی دیر بعد وہ اخبار میز پر ڈال کر بڑبڑانے لگا۔چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار تھے۔

کیا بات ہے؟'' حمید نے پوچھا۔

''پتہ نہیں یہ آدمیوں کی بستی ہے یا جانوروں کا ریوڑ۔اخبار اٹھاؤ....تو...قتل وخون اور عصمت دری کے علاوہ اور قسم کی خبریں نہیں دکھائی دیتیں!''

''آخر اس کی وجہ کیا ہے؟''

''مستقبل کی طرف سے مایوسی...خوداعتمادی کا فقدان!''

''اس کا علاج ہے کوئی!''

''شافی علاج ہے! مگر یہ دور ہے نئے تجربات کا۔ایک اسٹیج پر نئے تجربات بھی ختم ہوجائیں گے۔اس کے بعد پھر اسی دقیانوسی علاج کی طرف دنیا دوڑے گی....اعتدال، قناعت اور جہد مسلسل!''

''ٹھنڈا جہنم'' کا یہ اقتباس س ملاحظ کیجیے:

''جمشید نے اپنے جرائم کا اعتراف کرلیا ہے--- سرفراز کو اسی نے مارا تھا۔''

''آخر جمشید کو کیا سوجھی تھی۔کس چیز کی کمی تھی اس گھرانے میں۔''

''عقل سلیم کی۔چند آدمیوں کی ہوس ان ہی جیسے لاکھوں لوگوں کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور کر

www.urduchannel.in

دیتی ہے۔آزاد معشت والا نظام ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے انسانیت کے لیے سم قاتل بن گیا ہے!''

''کوئی حل ہے اس کا؟''

''زیادہ سے زیادہ لڑکیوں کے پیچھے دوڑ لگاؤ۔جی بھر کے عیاشی کرو اور بوڑھاپے میں اللہ پاک سے معافی مانگ کر جنت الفردوس کو سدھارو!''

فریدی کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔''

''ہولناک ویرانے'' میں جنسی بے راہ روی پر قدغن لگاتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس کیس کے دوران مجھ میں ایک ذہنی انقلاب ہوا ہے!''

''وہ کیا!''

''قدامت پر بری طرح جان دینے لگا ہوں۔عورتوں کے آزادانہ تعلقات اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا،جنسی معاملات میں جذبات کی تہذیب ناممکن ہے۔اس سلسلے میں سائنٹفک بحث بکواس ہے۔بچاؤ صرف پابندیوں میں ہے۔''

''مونچھ مونڈنے والی'' میں تو انتہا ہی کر دی۔یعنی آج کا نقشہ کھینچ دیا:

''جنسی جنونی عام حالات میں بڑے معصوم صورت اور فرشتہ خصلت ہوتے ہیں۔شرمیلا پن تو ان کے کردار کا جزو لازم ہوتا ہے لیکن جب (جنسیت کا) دورہ پڑتا ہے تو وہ بیوی، بیٹی، بہن، شوہر، بیٹا، بھائی میں بھی تمیز نہیں کر سکتے۔''

''ڈیڑھ متوالے'' کا ایک مکالمہ:

''میں شادی نہیں کروں گی۔میرے خیال سے تو آپ میری بھی تنخواہ لگا دیجیے!''

''بکواس ہے!'' صفدر جنگ سنجیدگی سے نرم لہجے میں بولا۔''شادی تو کرنی ہی پڑتی ہے۔جو نہیں کرتے وہ آوارگیوں میں پڑ جاتے ہیں۔عورتیں ہوں یا مرد!''

''سینکڑوں ہم شکل'' کا ایمان افروز اقتباس ہے:

''.....فریدی خاموش کھڑا ڈاکٹر کی لاش کی گھور رہا تھا۔

www.urduchannel.in

''مجھے اس کے انجام پر بہت افسوس ہے حمید!'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔''آدمی کی حیوانیت ہی اس انجام کا باعث بنی ہے....کاش اسے پاگل نہ بنایا ہوتا!....اس سے نوع انسانی کا درخشاں مستقبل وابستہ تھا لیکن آدمی نے خود ہی اپنا مستقبل تاریک کر لیا۔اوہ....حمید دیکھو تو ....کیا یہ دنیا کا بہترین دماغ نہیں تھا.....اگر یہ پاگل نہ ہو گیا ہوتا تو...آدمی کی مشکلیں آسان کرنے کے لیے کتنی راہیں نکالتا....لوگ اس سے محض اس لیے نفرت کرتے رہے کہ یہ بدصورت تھا۔چلو نفرت کر لیتے مگر اس کا اظہار کرنا کیا ضروری تھا.....اور پھر تمہیں حق کب پہنچتا ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی شکلوں سے نفرت ظاہر کرو جب کہ تم ان سے بدترین بھی بنانے پر قادر نہیں ہو.....آدمی نے خود ہی اپنی زندگی میں زہر بھرا ہے.....اور اب خود ہی تریاق کی تلاش میں سرگرداں ہے....وہ خدا تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اپنے پڑوسی تک بھی اس کی پہنچ نہیں ہے۔پڑوسی سے اس لیے متنفر ہے کہ وہ بدشکل ہے.....حسنِ ازل سے آنکھیں سیکنا چاہتا ہے.....لیکن وہ اندھا ہے....اسے بدصورتی ہی میں وہ جلوہ نظر نہیں آتا جس کی اسے تلاش ہے.....یا خدا....آدمی کو عقل دے...انسانیت کا مستقبل محفوظ کر...''

''پرنس وحشی'' میں روح کو لرزہ دینے والے جذبات دیکھیے:

''وہ بچہ.....خدا کی قسم وہ تا زندگی میرے ذہن سے چمٹا رہے گا.....مجھے سکون نہیں مل سکتا تا وقتیکہ انھیں صفحۂ ہستی سے نہ مٹا دوں....خدایا...وہ اپنی ماں کا خون چوس رہا تھا.....میرے معبود....آدمی کب تک درندہ رہے گا۔

''کالی تصویر'' میں عمران کا فکر انگیز آٹو گراف دیکھیے!

''آدمی سنجیدہ ہو کر کیا کرے جب کہ وہ جانتا ہے کہ ایک دن اسے اپنی سنجیدگی سمیت دفن ہو جانا پڑے گا۔''

دیو مالائی کردار ایسی باتیں کبھی نہیں سوچ سکتے ایسا صرف وہی سوچ سکتے ہیں جو زندگی سے بھرپور ہوتے ہیں۔مجھے کہنے دیجیے کہ ابن صفی کے کردار نہ صرف زندہ ہیں بلکہ زندوں کے بھی امام ہیں۔

O ان کرداروں کے زخم بھی لگتے تھے۔وہ بیمار بھی ہوتے تھے۔تھکان بھی ان پر سوار ہوتی تھی۔اورانھیں آرام کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ ''پرنس وحشی'' میں ابن صفی اس طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

''متواتر کام کرتے رہنے کی وجہ سے کم سے کم حمید کو تو یہی محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کا ذہن کچھ دنوں کے بعد مستقل طور پر بیکار ہوکر رہ جائے گا۔لہٰذا اس نے دو ماہ آرام کر نے کی تجویز پیش تھی جو کسی نہ کسی طرح فریدی کے حلق سے بھی اتر گئی۔''

O آوارہ گردی بھی انھیں معطل کرتی تھی۔راتوں میں وہ ٹارچ اور روشنی کے دوسرے سامان بھی اس استعمال کرتے تھے۔ چہروں پر گیس ماسک بھی پہنتے اور نقاب بھی ڈالتے نیز میک اپ کرنا بھی ان کا اصول تھا۔کبھی کبھی وہ مجرم کو پہچاننے کے باوجود بری طرح ناکام ہوجاتے تھے۔ان میں انسانی نفسیات، پسند ناپسند، کمزوریاں، خامیاں، غلطیاں پہچاننے اور پکڑنے کا بھی ملکہ تھا۔ایک انسان اپنی زندگی میں یہی سب تو کرتا ہے۔

O وہ لوگ کھانا بھی کھاتے تھے اور کافی، چائے سے شغل کرتے تھے اور اضافی طور پر فریدی سگار، حمید پائپ اور عمران کی چیونگم تو بہت ہی مشہور ہیں۔ جو آج کے شوقینوں کی مانند کھینی، جینتی اور کبیر کی طرح ان کی جیبوں میں رہتی تھی اور وہ ان کے وقت بے وقت استعمال کرتے تھے۔

O ان کے رشتے ناطے بھی تھے، تعلقات اور دوستیاں بھی تھیں۔خاندان اور قبیلے بھی تھے۔ان کے رہنے سہنے کے گھر و مکانات بھی ایسے ہی تھے جیسے ہمارے ہوتے ہیں۔عمران کا فلیٹ، سکریٹ سرویس کا ہیٹ کوارٹر، دانش منزل، رانا تہور علی صندوقی کا محل ''رانا پیلیس'' ''سائیکو منشن'' فریدی کا گھر، اس میں وسیع و عجیب و غریب تجربہ گاہ، گیراج، خواب گاہ سب کچھ۔رحمان صاحب کی کوٹھی، سر سلطان کا بنگلہ، فیاض کا فلیٹ، سر ولیڈی تنویر کا لگژری کاٹیج،

www.urduchannel.in

اسی طرح سر بہرام کی کوٹھی۔ان کی تفریح کے لیے جوئے خانے، چائے کے ہوٹل، رہائشی و غیر رہائشی اعلا انتظام و سہولیات سے لیس ہوٹلوں، کیفوں اور نائٹ کلبوں کے نام بھی جانے پہچانے۔ٹپ ٹاپ، پیراماؤنٹ، آرلکچنو، میٹرو، میس جوائنٹ، مئے پل وغیرہ۔ بڑے شہروں کے طرز پر ان کے شہروں میں بھی ساحل سمندر پر کاٹیج، چھول داریاں اور ہٹس بنے ہوئے تھے۔جھیلوں اور سمندروں میں اترنے کے لیے بوٹ، کشتیاں، اسٹیمرس اور غوطہ خوری کے مخصوص لباس بھی ہوتے تھے۔ان کے پہننے اوڑھنے کے کپڑے بھی عام انسانوں کے سے ہی ہوتے...غرض سر سے پیر تک وہ ہر معاملے میں جیتے جاگتے انسان تھے جن پر سردی، گرمی، حالات، ماحول، سماج اور معاشرے کے سدھار و بگاڑ سب کے اثرات مرتب ہوتے تھے۔

O اسی طرح اگر اُنھیں کہیں جانا آنا ہوتا تو ان کی سواری کے لیے عام گاڑیاں تھیں۔وہ دیو مالائی کرداروں کی طرح سیمرغ، اڑن طشتری، جادوئی قالین یا عقابوں پر بیٹھ کر نہیں جاتے تھے بلکہ (ایرکنڈیشن) لنکن، بیوک، کیڈی لاک، مختلف کمپنیوں کی ٹوسیٹرس، شیورلٹ، سیڈان، رولز، فیاٹ کی مصنوعات، فورڈ کی مصنوعات وغیرہ ہی ان کے حمل و نقل میں کام آتی تھیں۔ بالخصوص عمران اور فریدی کی گاڑیوں میں تو لاسلکی آلات بھی لگے رہتے تھے جن کے ذریعے وہ اپنے ماتحتوں کو مختلف انداز میں ہدایات دیتے اور ان کے پیغامات وصول کرتے تھے۔فریدی کی گاڑی میں تو کمپیوٹر بھی نصب تھا جو آنا فانا میں معاملات کی تہہ میں جانے میں معاون ثابت ہوتا۔ان گاڑیوں کا رجسٹریشن بھی ہوتا تھا اور وہ پنکچر بھی ہوتیں نیز مجرم انھیں بیکار بھی کردیتے تھے ان میں پیٹرول مصنوعات کے ایندھن ہی استعمال ہوتے تھے۔

O ان کرداروں میں سے ذمے داروں کے پاس حالات و واقعات، مخصوص صورت حال اور پل پل کی اطلاع کے لیے ٹرانس میٹر بھی ہوتے تھے سربراہوں کی تو گاڑیوں میں بھی نصب ہوتے اور ماتحت انھیں جیبوں میں لیے پھرتے تھے۔ چنانچہ بارہا ان کے

ناولوں میں تذکرے ملتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی ان کے زندہ، انسان اور حقیقی ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ دنیاوی چیزیں دیو مالائی کردار استعمال نہیں کرتے۔ انھیں ان کی کیا ضرورت وہ تو پہلے پل میں یہاں اور دوسرے لمحے وہاں۔

O اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو لوگ معاشرے کے حساس ترین لوگوں میں شمار ہوتے ہیں وہ جب کسی مصیبت میں اس طرح گرفتار ہوتے ہیں کہ بچنے کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں تو اس وقت ان کی ''چھٹی حس'' کام کرتی ہے۔ ابن صفی کے محبوب ترین کردار فریدی اور عمران اکثر مصیبت کے اوقات میں اس کا سہارا لیتے تھے اور پوری فوج کو بچا لے جاتے تھے۔ چھٹی حس صرف انسانوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ عفریت میں وہ حس نہیں ہوتی۔ پری سوچ و فکر سے عاری ہوتی ہے۔ دیو عقل سے خالی گھر ہوتا ہے اور ابلیس و اس کی مادہ کبھی مثبت نہیں سوچ سکتے۔

.....اور اس طرح ابن صفی کرداروں کے معاملے میں اپنے معاصرین سے آگے نکل گئے اور ایشیا کے محبوب ترین مصنف بن گئے۔ ابن صفی سے بڑے مصنفین تو ہو سکتے ہیں مگر ان کے ہم سر و ہم پلہ کوئی نہیں ہے۔ زیادہ لکھنے والے معیاری مصنف نہیں کہلاتے؟ تھوڑا لکھ کر بڑا کام کرنے والے اور قارئین پر اپنے گہرے نقش ثبت کرنے ہی دراصل بڑے ہوتے ہیں اور یہ سعادت مصنفین کے گروہ میں صرف ابن صفی کے حصے میں آئی ہے۔.....ایسے نایاب اور زندہ کرداروں کے خالق ابن صفی کے لیے میں وہی کہوں گا جو ابوالطیب محمد متنبّی نے اپنے ممدوح سیف الدولہ کے لیے کہا تھا:

زمانے گزرے ہیں کتنے نہ آیا آپ سا کوئی
جب آئے آپ تو ثانی نہیں ہے آپ کا کوئی

www.urduchannel.in

ماخذو مراجع

ہاشمی۔ ابوذر۔ ڈرامہ نگاری کے اصول (: مرتبہ) دہلی۔ اردو اکادمی۔ 2000

کمال۔ حسن۔ وہ منظر یاد آتا ہے۔ ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ اردو بک ریویو۔ 2014

ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ اردو بک ریویو۔ 2013

روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد: بحوالہ ڈائجسٹ نما۔ اشاعت 26 جولائی 1980

سہ ماہی اردو بک ریویو، نئی دہلی۔ شمارہ مارچ، اپریل 2007

دوسری آنکھ: جاسوسی ادب۔ (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ فرید بک ڈپو۔ جولائی 2008

پرنس وحشی: جاسوسی ادب۔ (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ فرید بک ڈپو۔

چالیس ایک باون: جاسوسی ادب (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ فرید بک ڈپو۔

پتھر کا خون: جاسوسی ادب۔ (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ فرید بک ڈپو۔ دسمبر 2005

سیاہ پوش لٹیرا۔ جاسوسی ادب۔ (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ فرید بک ڈپو۔ مارچ 2007

عظیم حماقت: جاسوسی ادب۔ (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ فرید بک ڈپو۔ اپریل 2012

مونچھ مونڈنے والی: جاسوسی ادب۔ (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ فرید بک ڈپو۔ مارچ 2007

پیاسا سمندر (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ فرید بک ڈپو۔ اپریل 2006

کنگ چانگ: جاسوسی ادب۔ (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ فرید بک ڈپو۔ دسمبر 2009

مورثی ہوس: جاسوسی ادب۔ (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ فرید بک ڈپو۔ اپریل 2012

زہریلا سیارہ: (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ فرید بک ڈپو۔ اپریل 2012

ہولناک ویرانے: جاسوسی ادب۔ (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ فرید بک ڈپو۔ اکتوبر 2008

ٹھنڈا جہنم: جاسوسی ادب۔ (مرتبہ) عارف اقبال۔ نئی دہلی۔ فرید بک ڈپو۔ ستمبر 2011

کالی تصویر: جاسوسی ادب۔(مرتبہ) عارف اقبال۔نئی دہلی۔فرید بک ڈپو۔اپریل 2006

سانپوں کا مسیحا۔جاسوسی ادب۔(مرتبہ) عارف اقبال۔نئی دہلی۔فرید بک ڈپو۔ستمبر 2011

تصویر کی اڑان: جاسوسی ادب۔(مرتبہ) عارف اقبال۔نئی دہلی۔فرید بک ڈپو۔جولائی 2008

آنکھ شعلہ بنی: جاسوسی ادب۔(مرتبہ) عارف اقبال۔نئی دہلی۔فرید بک ڈپو۔جولائی 2008

پتھر کا خون: جاسوسی ادب۔(مرتبہ) عارف اقبال۔نئی دہلی۔فرید بک ڈپو۔دسمبر 2005

خطرناک بوڑھا: جاسوسی ادب۔(مرتبہ) عارف اقبال۔نئی دہلی۔فرید بک ڈپو۔فروری 2006

بے چارہ شہ زور: (مرتبہ) عارف اقبال۔نئی دہلی۔فرید بک ڈپو۔

خون کا دریا: جاسوسی ادب۔(مرتبہ) عارف اقبال۔نئی دہلی۔فرید بک ڈپو۔جولائی 2006

لاشوں کا آبشار: جاسوسی ادب۔(مرتبہ) عارف اقبال۔نئی دہلی۔فرید بک ڈپو۔دسمبر 2004

سانپوں کا مسیحا: جاسوسی ادب۔(مرتبہ) عارف اقبال۔نئی دہلی۔فرید بک ڈپو۔ستمبر 2011

خطرناک لاشیں: جاسوسی ادب۔(مرتبہ) عارف اقبال۔نئی دہلی۔فرید بک ڈپو۔ستمبر 2006

ڈیڑھ متوالے: جاسوسی ادب۔(مرتبہ) عارف اقبال۔نئی دہلی۔فرید بک ڈپو۔ستمبر 2007

سینکڑوں ہم شکل: جاسوسی ادب۔(مرتبہ) عارف اقبال۔نئی دہلی۔فرید بک ڈپو۔

✸ ✸ ✸

www.urduchannel.in

راجپوتانہ/ راجستھان میں اردو

کچھ مخفی حقیقتوں کا انکشاف

اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے اور تحقیق شدہ بات بھی ہے کہ اردو دہلی ونواح دہلی کے علاقوں میں پیدا ہوئی اور یہیں سے اس کا آغاز بھی ہوا مگر اس بات کی تعین کسی محقق نے نہیں کیا کہ دہلی واس کے نواحی علاقوں کی حدیں کہاں تک تھیں۔کیا اس وقت کے راجپوتانہ کا شمار بھی اس میں ہوتا تھا یا نہیں؟ یہ سوال اہم بھی ہے اور جواب طلب بھی۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ دہلی سے متصل راجپوتانہ کے علاقے بھی اس میں آتے تھے۔ریاست بھرت پور بھی آگرہ و متھرا کی طرح برج کے علاقوں میں آتی تھی اسی طرح ریاست الور، جے پور واجمیر بھی دہلی ونواح دہلی کے علاقوں میں شامل ہوتی تھیں۔میری اس بات کی تائید پروفیسر ژول بلاک کے اس اعتراف سے بھی ہوتی ہے جس میں انھوں نے اردو کی اولین نشونما اور جائے پیدائش کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔لکھتے ہیں:

’اردو یقیناً دہلی ونواح دہلی میں پیدا ہوئی۔اور دہلی ونواح دہلی کے علاقوں میں راجپوتانہ کی ریاستیں، ہریانہ اور پنجاب کے کچھ علاقے شامل ہیں۔‘‘

اس بات کے ثابت ہوجانے کے بعد کہ دہلی واطراف دہلی کن علاقوں کو کہا گیا، سابق راج پوتانہ میں اردو کے فروغ اردو کا پتا چلتا ہے۔ جے پور کے مہاراجہ جے سنگھ نے جب ریاست جے پور کی کمان اپنے ہاتھ میں لے کر شہر جے پور کی بنیاد ڈالی، پھر اسے اپنا پائے تخت بنایا تو شہر کے باشندگان کے لیے انھوں نے اردو سیکھنا لازم قرار دیا۔ مہاراجہ خود بھی اردو دانی/خوانی کا نفیس ذوق رکھتے تھے اور اپنے درباریوں کو بھی انھوں نے اردو سیکھنے کی ترغیب دی۔ نیز ان کی ریاست میں ملازمت کی شرط اول یہ تھی کہ امیدوار اردو داں اور اردو خواں ہو۔ اس کے بعد چاہے اس کی علمی قابلیت کسی بھی طرح کی ہو مگر اسے ملازمت ہر حال میں ملتی تھی۔ عوام کو اردو سکھانے کی غرض سے ریاست سے کچھ کتابچے بھی شائع ہوئے اور جگہ جگہ اردو مجلسیں قائم کی گئیں۔

ریاست جے پور سے متصل ریاست اجمیر کا بھی کم وبیش یہی حال تھا۔ عارف اجمیری کہتے ہیں:

''مہاراجہ کی طرف سے عام اعلان تھا کہ تمام بااثر افراد اردو سیکھیں اور اپنی ذمے داری پر دس دس لوگوں کو اردو سکھائیں، پھر سیکھنے والوں کو سند دیتے وقت یہ تلقین کریں کہ وہ بھی دس دس افراد کو اردو سکھائیں۔ پھر جہاں تک یہ سلسلہ چلے، چلتے رہنا چاہیے۔''

الور اور بھرتپور ریاستوں کے صدر مقامات کے درمیان حالانکہ ڈیڑھ سو کلومیٹر کا فاصلہ تھا مگر چونکہ ریاستی علاقے ایک دوسرے سے متصل تھے اس لیے بھرت پور برج میں ہونے کے باوجود راجپوتانہ کی دیگر ریاستوں سے اردو کے فروغ واشاعت میں پیچھے نہیں رہا۔ اس نے اپنی پڑوسی ریاستوں، الور، جے پور اور اجمیر کی روش کو اپنایا۔ چنانچہ بھرت پور کے وقائع نویس لکھتے ہیں کہ مہاراجہ بھرت پور اکثر کہتے تھے:

''اردو سے مجھے اپنی ماں کی طرح محبت ہے، میں چاہتا ہوں کہ یہاں سے اردو کے

www.urduchannel.in

بڑے بڑے عالم پیدا ہوں اور میری ریاست کا نام روشن کریں۔''

مہاراجہ بھرت پور کی اردو نوازی کا ثمرہ ہی تھا کہ مرزا غالبؔ جیسے عظیم شاعر متعدد بار بھرت پور گئے اور ریاست کے متعدد انعامات واعزازات سے سرفراز ہوئے۔ اسی طرح دیگر مشاہیر شعرا کا بھی وہاں ورود ہوتا تھا۔

بھرت پور کی طرح الور میں غالبؔ کی تشریف آوری ہوتی بلکہ ان کے کچھ مایا ناز شاگرد بھی اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے، جنھیں غالبؔ خط لکھتے اور ان کا جواب حاصل کرتے تھے۔

راجپوتانہ یا راجستھان نے کس طرح اردو شاعروں، قلم کاروں اور دانشوروں کو اپنے دل میں جگہ دی اور انھیں اپنایا اس کا اندازہ ڈاکٹر فیروز احمد کی اس تحریر سے لگایا جاسکتا ہے انھوں نے اپنی کتاب ''نغمات آزادی'' میں رقم کی ہے:

''(چونکہ) راجستھان کا براہ راست جنگ آزادی سے کوئی تعلق نہیں تھا لہٰذا اس خطے کو نسبتاً پرامن اور محفوظ سمجھ کر شاہ نصیر احمد، مرزا غالب، ذوق اور امام بخش صہبائی وغیرہ کے متعدد تلامذہ یہاں کی مختلف ریاستوں یا امرا کی سرکار سے وابستہ ہوگئے، کچھ ایسے بھی تھے جو تلاش معاش میں آئے اور پھر یہیں پیوند خاک ہوگئے۔''

اسی طرح ڈاکٹر فیروز مسرت راجپوتانہ کی ریاستوں میں اردو کے فروغ واشاعت کے سنہری دور کو یاد کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''جب 1857 میں دہلی ولکھنؤ سمیت شمالی ہند کے دبستان اردو وشعر وسخن اجڑے تو شعرا واہل قلم حضرات نے ان ہی ریاستوں میں پناہ لی تھی۔ اس پراشوب دور میں ان کی اہم ترین منزل راجپوتانہ ہی کی ریاستیں ہی تھیں جن میں ریاست جے پور کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ ان شعرا میں شاہ نصیرؔ، مرزا غالبؔ، ذوقؔ اور امام نقش صہبائیؔ کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ شاگردوں کے علاوہ متعدد اساتذہ نے بھی سرزمین راجپوتانہ کو اپنا

مسکن بنایا ان میں ظہیر دہلوی، انور دہلوی، غلام احمد تصور، آگاہ دہلوی، محمد علی تشنہ، راقم دہلوی، رفعت دہلوی، درویش دہلوی، مرزا عباس بیگ عباس، حکیم محمود علی خاں محمود، زین العابدین خاں عابد، آغا دہلوی، امراؤ بیگم رام پوری، شیو پرساد مہجور دہلوی، سید ناصر الدین خاں ناصر لکھنوی، خوب علی خاں حقیر دہلوی، سید مہدی حسن مجروح دہلوی اور مرزا قربان علی بیگ خاں سالک حیدر آبادی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔''

یہ وہ شعرائے کرام اور اہل قلم ہیں جنھیں اردو کی آبرو کہا جاتا ہے۔ اندازہ کیجیے جب ان حضرات کی یہاں مجلسیں جمتی ہوں گی تو کیا عالم ہوتا ہوگا۔ یقیناً راجپوتانہ کی فضاؤں میں اردو کے زمزمے گونجتے ہوں گے۔

تاریخ شاہد ہے کہ راجستھان نے ان تمام اساتذہ کرام، شعرا اور ادبا کو ایسی اپنائیت عطا کی کہ وہ اپنا وطن بھول گئے۔ راجستھان کی فراخ دلی، دلکش قدرتی مناظر، شاہی محلات کی صنعت، انداز شہنشاہی اور طرز زندگی نے ان کے فنون کو نئے استعارے، تشبیہات، افکار اور رنگ دیے۔ یہاں آکر ان کا فن عروج کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ تاہم یہاں ہجرت کر کے آنے والے شعرا و ادبا نے اپنی وطنی نسبت نہیں چھوڑی تھی ورنہ آج دہلی اور لکھنؤ کے طرز پر راجستھان بھی ایک اسکول اور دبستان سخن بن جاتا۔

پھر جب انڈین یونین میں شامل ہو کر راجپوتانہ ''راجستھان'' بن گیا اور اس کی تمام ریاستیں اس میں ضم ہو گئیں تو جیسے قصر اردو کی بساط ہی اُلٹ گئی، لکھنؤ اور دہلی جس طرح اردو شعرا کے مقتل بنے اسی طرح یہاں بھی انھیں اردو سمیت دفن کر دیا گیا۔ اردو سے نفرت اور عداوت نے یہاں کے لوگوں کو بری طرح اردو سے بے زار کر دیا۔ اس وقت راجستھانیوں بالخصوص ہندوؤں کا تصور ہو گیا تھا کہ اردو ایک خاص فرقے کی زبان ہے اور ہمارے لیے شجر ممنوعہ اور اچھوت و ناپاک چیز کے برابر ہے۔ اردو کا قتل اس کے گھر میں کیسا ہوا، اگر کسی

www.urduchannel.in

کو یہ منظر دیکھنا ہو تو وہ راجپوتانہ کے بعد ''راجستھان'' میں اردو کا حشر دیکھے۔

خرمن اردو پر برپا ہونے والی اس قیامت صغری نے یوں تو کچھ بھی نہیں چھوڑا پھر بھی مشیت خداوندی سے دو چار چنگاریاں اردو سے نفرت کی آگ کی زد سے بچ گئیں جو دیکھتے دیکھتے ہی راجستھان میں اردو کا روشن چراغ بن گئیں، پھر رفتہ رفتہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور ایک کے بعد ایک چراغ اردو روشن ہوتا جا رہا ہے۔

اس موقع پر فروغ اردو کی کوششوں کے سلسلے میں اگر میں سابق ریاست ٹونک اور موجودہ ضلع ٹونک کا ذکر نہ کروں تو بڑی ناسپاسی ہوگی، ٹونک راجستھان کے آسمان اردو پر ہمیشہ ماہتاب و آفتاب بن کر چمکا ہے۔ ماضی میں اس شہر فرخندہ حال نے اردو دنیا کو حافظ محمود خان شیرانی، محمد داؤد خان 'اختر شیرانی'، بسمل سعیدی، مخمور سعیدی، جاوید حبیب، خلیق ٹونکی وغیرہ جیسے عظیم استاذ، محسن اردو شاعر، ناز اردو و فخر اردو قلم کار، بہترین منتظم و سرتاج صحافت اور نامور خطاط دیے ہیں۔ نیز ٹونک کی جانب سے جہان اردو کے لیے داد و دہش کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور اس کی مردم خیزی و اردو سے محبت، صحرا میں نخلستان کی مانند ہے جس کی بقا میں ناز برداران اردو مصروف ہیں۔ عالم یہ ہے کہ جس قدر پورے راجستھان میں اردو کے چراغ روشن ہیں اس سے کہیں زیادہ اکیلے ضلع ٹونک میں ہیں۔ ٹونک کا ماضی بھی تابناک تھا، حال بھی روشن اور مستقبل میں بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

آزادی کے بعد ہندوستان بھر میں جدید نظام تعلیم کا نفاذ کیا گیا تو اس غرض سے کچھ یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا، یا جو پہلے سے موجود تھیں ان کی ضروری مرمت کر کے ان میں پڑھائی کا آغاز کیا۔ ملک بھر کی یونیورسٹیوں میں دیگر شعبہ جات کے ساتھ اردو بھی ضروری قرار دی گئی۔ چنانچہ راجستھان میں پھر سے اردو کا آغاز ہوا اور یونیورسٹی آف راجستھان، جے پور، میں اردو کا شعبہ قائم ہوا، اردو کے عاشقوں نے وہاں سے اردو سیکھی

بھی مگر کچھ عرصے بعد اسے شعبہ فارسی میں ضم کر دیا گیا، اسی وقت سے وہاں اردو و فارسی ایک ساتھ جاری ہیں۔ ان دنوں پروفیسر عابدہ بیگم ان دونوں مشترکہ شعبہ جات کی سربراہ ہیں۔

دوسرا نام اس سلسلے میں سینٹرل یونیورسٹی موہن لال سکھاڈیا یونیورسٹی، ادے پور کا آتا ہے جہاں آزادی کے بعد سے اب تک اردو کی تعلیم جاری ہے۔ موجودہ زمانے میں ڈاکٹر حدیث انصاری، ڈاکٹر شاہد پٹھان جے پوری علاوہ دیگر اساتذۂ اردو کی مدد سے یہاں اردو کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہے۔ متعدد طلبا نے یہاں سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور متعدد ابھی زیر تعلیم یا قریب التکمیل ہیں۔

راجستھان اردو اکادمی، جے پور کا نام بھی اس سلسلے میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں اس نے اپنے قیام کے پہلے دن سے اردو زبان و ادب کی ترویج اشاعت کے لیے مختلف کوششیں کیں وہیں سہ ماہی 'نخلستان' جاری کر کے راجستھان کے صحراؤں میں اردو کی فرحتیں عام کر دیں۔ 'نخلستان' کے متعدد نمبرات، خصوصی شمارے اردو ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافے کا باعث ہیں۔ بلکہ موجودہ دور میں ارد واور 'نخلستان' دونوں ایک دوسرے سے عبارت ہیں۔

مدارس، جامعات و ادارہ جات کے علاوہ بھی راجستھان میں اردو کا فروغ ہو رہا ہے اور یہ حضرات انفرادی طور پر اردو کے روشن چراغ ہیں جن میں ڈاکٹر فیروز عالم، فکشن نگار ڈاکٹر ثروت خان، مختار ٹونکی۔ ڈاکٹر سید صادق علی (لیکچرر شعبۂ اردو گورنمنٹ پی جی کالج، ٹونک) ارشد عبدالحمید ٹونکی۔ شین کاف نظام (شیوکشن نظام) عادل رضا منصوری، مسلم سلیم، خدا دادمونس، ڈاکٹر خالد محمود (مدیر، پندرہ روزہ ہماری طاقت، جے پور) شاہد پٹھان جے پوری، شیخ اسرارالحق (مدیر، پندرہ روزہ سائمہ ٹائمز: اردو۔ ہندی) جے پور) ڈاکٹر جتیندر پر کاش دیول۔ حبیب کیفی، عزیز اللہ شیرانی، معین الدین شاہین بیکانیری، ڈاکٹر ضیاء الحسن

www.urduchannel.in

قادری، قاسم بیکانیری، احتشام اختر کوٹوی (لیکچرر شعبۂ اردو گورنمنٹ پی جی کالج، کوٹہ) ڈاکٹر زیبا زینت، ڈاکٹر اسما مسعود، ڈاکٹر فیروز مسرت، ملکہ نسیم جے پوری۔ عابدہ بیگم، سعید جے پوری، ڈاکٹر روشن بھارتی (معروف غزل سنگر) دانش اجمیری، کریم الوری، نثار بھرت پوری، وسیم سوائی مادھوپوری وغیرہ کا نام خصوصی طور پر لیا جاتا ہے۔ ان حضرات میں سے اکثر شعرا ہیں، کئی بہترین افسانہ نگار اور مصنف ہیں، ممتاز ادیب، فکشن نگار، استاذ، صحافی، نغمہ نگار اور ادبی تنظیموں کے سربراہ ہیں۔

ان ذی عزت حضرات نے نہ صرف راجستھان میں اردو کا بار سنبھال رکھا ہے بلکہ اس کی روشنی نئی نسل تک پہنچانے کی بھی کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔ ان کے حق میں میری پر خلوص دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور انھیں نیّر تاباں بنا دے۔

ماخذ و مراجع

اردو کا مولد: پروفیسر ژول بلاک، نسخہ مخطوطہ، میوات اکیڈیمی، الور۔ 1933

صدیقی۔ انجم۔ مہاراجہ جے پور اور اردو۔ جے پور۔ انجمن محبان اردو۔ 1999

اجمیری۔ عارف۔ ریاست اجمیر میں اردو کا فروغ۔ اجمیر۔ کاشانۂ عارف، 2000

فیروز احمد۔ ڈاکٹر۔ نغمات آزادی۔ جے پور راجستھان اردو اکادمی، 1993

مسرت، فیروز انور دہلوی، ایک مطالعہ۔ (مضمون مشمولہ خواتین نگارشات نمبر، ماہنامہ زبان و ادب، پٹنہ بہار اردو اکادمی۔ جنوری تا اکتوبر 2010

✸ ✸ ✸

ابن صفی کے ناول اور تصوف

انسان کی زندگی میں دکھ، پریشانیاں، تناؤ، محرومی اور افسوس کبھی قدرت کی جانب سے آتی ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خود انسان اپنے کرتوتوں سے اپنی زندگی میں کانٹے بوتا ہے اور پھر پھلوں و پھولوں کی امید کرتا ہے۔ لوک کہاوت ہے:

'بویا پیڑ ببول کا پھل کہاں سے کھائے'

یہ ہر شہر، ملک بلکہ ساری دنیا کا المیہ ہے مگر انسان اس پر غور کرنے کے بجائے ایسا کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ قدرت کی کارکردگیوں سے کھلواڑ، نظام فطرت کے خلاف بغاوت، حق پر بدی کا غلبہ، اس کا حسین مشغلہ بن جاتا ہے۔ وہ قدرت کے عذاب اور اپنے فطرت کی سزا سے بے پروا ہو کر من میں سمایا ہوا سودا پورا کرتا رہتا ہے۔ نتیجتاً اس کی زندگی ایک پھوڑا بن جاتی ہے اور جسم کا ریشہ ریشہ افراتفری کا ناسور بن جاتی ہے۔ اس وقت اسے روحانیت اور سکون کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ نہ جانے کہاں کہاں جاتا ہے۔ خوش قسمتوں کا نجات بھی ملتی ہے اور بدقسمت آہ و کراہ بھرتے دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ لوگ کی زبان سے نکلتا ہے:

'خس کم جہاں پاک، ہوا قصہ تمام'

www.urduchannel.in

دکھوں سے بھرا انسان جو راہ نجات تلاش کرتا ہے اسے 'تصوف' اور 'روحانیت' کی تلاش کہا جاتا ہے۔ تصوف اور صوفیت کی پناہ میں آ کر انسان گناہوں اور اپنی بدکاریوں پر روتا ہے اور اپنے کیے کی معافی حق تعالیٰ سے مانگتا ہے۔ 'حق ھو' کی ضربیں لگا کر نیز روحانیت کا احساس پا کر وہ گناہوں کے بوجھ سے آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ ایک نہج اور طریقہ ہے جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے اور تباہ حال انسانیت جام بقا پیتی آ رہی ہے۔

اس طریقے سے الگ اور جدا بھی ایک اور طریقہ ہے مگر اس کی جانب سے کسی کی توجہ نہیں اور نہ ہی دھیان۔ وہ تحریری ذریعہ ہے جس کے ذریعے حق کی اشاعت اور سچائیوں کو فروغ دیا جاتا ہے۔ فکرمند اور حساس قلم کاروں کے ذریعے معاشرے کے ناسوروں کی نشان دہی ان کی تحریروں میں کی جاتی ہے اور ان برائیوں کو دور کرنے کے لیے اقدام کیے جاتے ہیں۔ برے انسانوں کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا جاتا ہے اور گم راہوں سیدھی راہ دکھانے کی تلقین کی جاتی ہے۔

تحریری طریقہ افسانوی بھی ہوتا ہے اور ناولوں کے ذریعے بھی یہ کام کیا جاتا ہے۔ مضامین و مقالات بھی بسا اوقات اس غرض سے لکھے اور شائع کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں دوسرے معاصر قلمی ذرائع کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ قلم کار پر منحصر ہے کہ وہ کیا اور کسے استعمال کرتا ہے مگر ان کے شہ پاروں کے مقصد کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

چوں کہ تصوف کا ایک مطلب ہے 'حق' کہنا۔ حق کی اطاعت کرنا اور حق کی اشاعت کرنا بھی۔ 'حق' کی بلندی کی خاطر لڑنا اور جدوجہد کرنا۔ تصوف کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ آدمی 'تحفظ حق' کی خاطر آلودگیوں اور کثافتوں سے بھرے معاشرے سے یہ کہتے ہوئے دور نکل جائے کہ 'ان کا کچھ نہیں ہو سکتا' اور جنگلوں میں جا کر کسی کٹیا اور گھروندے میں جا کر رہے۔ ہاں! دوسری اقوام میں ممکن ہے اس کی گنجایش ہو یا ان کی یہی تعلیمات و ہدایات ہوں، مگر

اسلام میں اس کی قطعی گنجایش نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

لا رھبا نیة فی الاسلام

یعنی اسلام میں رہبانیت اور سماج سے کٹ کر جنگلوں، بیابانوں اور غیر آباد علاقوں میں رہنے کی کوئی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلام اجتماعیت اور یک جہتی کا علم بردار ہے۔ نیز اس طرح کرنا اسلام کی اصل روح کے ہی خلاف ہے۔ اس کی تعلیم تو یہ ہے کہ سماج کے دکھ درد اور مصائب و مسائل مل بانٹ کر حل کیے جائیں اور انسانوں کے درمیان رہ کر اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کی آرزو کی جائے۔

ہم اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ انسان جب سماج میں رہے گا۔ سوسائٹی اور اہلیان سوسائٹی سے رشتہ ناطہ جوڑے گا تو اسے کچھ اچھا بھی لگے اور بہت کچھ برا بھی۔ کچھ اس کے سامنے مثبت آئے گا اور بہت کچھ منفی بھی۔ کچھ امور اس کے ضمیر کے مطابق ہوں گے اور بہت کچھ کو دیکھ کر اس کا خون کھولے گا بھی۔ یہی وقت اس کے اصل امتحان کا وقت ہے اور یہیں اس کے سلوک و احسان کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہیں سے دیکھا جاتا ہے کہ وہ کس طرح مثبت حالات، کیفیات اور عناصر کی پذیرائی کرتا ہے اور منفیات سے کس طرح مقابلہ کرتا ہے یا ان کے سد باب کے لیے کیا تدبیر اختیا کرتا ہے۔ اب دو صورتیں ہیں! اگر وہ موافقات و مثبتات کی کما حقہم پذیرائی کرتا ہے اور انھیں فروغ و اشاعت دینے میں اپنا تن من دھن لگا دیتا ہے، چاہے اس کے پاس کوئی بھی ذریعہ ہو مثلاً قلم، وقار، عہدہ، رتبہ، مقام، تنظیم وغیرہ، تو وہ ایک اچھا انسان اور اپنے فرض انسانیت کو ادا کرنے والا فرد ہے۔ یہی تصوف کا اصل حاصل ہے اور حقیقی مقصد بھی۔ اسی مقصد سے خانقاہیں بنی ہیں اور اسی لیے اولیاء اللہ نے روحانی محفلیں سجائی ہیں۔ بقول شخصے:

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

دوسری صورت میں اگر وہ منفیات پر خاموش رہا اور ان سماج دشمن عناصر کو پنپنے دیتا رہا یا ان کی پشت پناہی کرتا رہا، تو چاہے وہ لاکھ شریف انسان ہو، لاکھ دولت مند اور عہدے و وقار والا ہو، لاکھ وہ قلم کار ہو، وہ معاشرے کا اچھا انسان اور اچھا فرد نہیں ہے، بلکہ ایک ناسور ہے اور ایک بدبودار وجود۔ ایسا انسان شیطان کا ایجنٹ اور خدا کا دشمن ہے۔

20 ویں صدی کے عظیم مصنف ---- باوقار انداز---- اور معیاری تحریروں کے مالک ابن صفی (بی اے) ایسے ہی قلم کار تھے، جنھوں نے سماج اور معاشرے اور مغرور و طاقت ور دنیا کی جانب سے کمزور ں ممالک و انسانوں کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے خلاف لکھا اور ببانگ دہل لکھا۔ ان کے صدہا ناولوں کی 'بین السطور' کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کے سینے میں انسانیت اور حق کی بلندی و فروغ کے لیے ایک ایسا درد اور احساس موجود تھا جس نے ان کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ وہ دنیا کے بگڑے ہوئے نظام و معاشرت کو سدھرا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بقول اقبال ایسا نہیں کہا:

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا

بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ دولتِ قلم کو انھوں نے اس طرح برتا کہ دنیا بھر میں ایک انقلاب سا آ گیا۔ ان کے ہزاروں قارئین ان تحریروں میں اپنے لیے سامان زندگی اور قلبی سکون پاتے تھے اور ان کے زیر اثر ان کے اندر جرائم و بدیوں سے نفرت اور

www.urduchannel.in

اشاعت حق کے جذبات بیدار ہوتے تھے۔ یہی تو تصوف کا اعلا مقام ومطالبہ ہے۔ تصوف کے ذریعے یہی تو چاہا جاتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بعد اپنے سماج ومعاشرے وملک کا ہمدرد بن جائے۔ اس کے آئین سے سرتابی نہ کرے اور ملکی انتظام سے تعاون کرے۔ اسی طرح دنیا بھر میں انسانوں کی حقوق تلفی واتلاف جان کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی زمین پر پھیلتے فساد کو روکے۔ مجرمین کے خلاف قانون کی بالادستی کی ہم نوائی کرے اور جرائم سے پاک دنیا کے تصور ومنصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اس کی خاطر کام کرنے والے اداروں کی مدد کرے اور ان کی کامیابی کی دعائیں کرے۔ یہی عین حق ہے اور یہی تصوف ہے۔

معین الحق صدیقی ابن صفی کی اسی خوبی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابن صفی (بی اے) میں مجھے ایک صوفی نظر آتا ہے۔ انھوں نے 'جرائم پر قانون کی بالادستی' کا انوکھا کا فارمولہ دنیا کو دے کر اس مشن کو زندہ کیا ہے جسے صوفیائے عظام نے جاری کیا تھا اور جو انھیں جاں سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ کیا چاہتے تھے؟ یہی نا کہ اللہ کے بندے برائیوں، بدیوں، ایک دوسرے کے خلاف ناانصافیوں اور حقوق تلفیوں سے باز آ کر نیکوکار، اچھے اور ایک دوسرے کا حق ادا کرنے والے بھائی بھائی بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو ایک کنبے کے افراد بنا کر پیدا کیا ہے، مگر یہ نادان گمراہ ہو گئے، شیطان مردود نے ان کے اندر خلیجیں اور دراڑیں پیدا کر دیں۔ یہ پھر سے اپنی منزل کی طرف چل پڑیں اور پھر سے ایک ہو جائیں۔

پہلے دائرہ محدود تھا۔ علاقوں، شہروں اور ملکوں تک صوفیائے عظام کی تعلیمات محدود تھیں مگر ابن صفی کے زمانے میں بلکہ عہد موجود میں جب کہ ساری دنیا ایک گاؤں بن گئی اور گلوبلائزیشن ایک ناقابل تسخیر نقطہ بن گیا، تمام دنیا کے فاصلے مٹ گئے، ایسی صورت میں دائرہ بھی وسیع ہو گیا اور اسی وسیع دائرے کی اصلاح وتزکیہ ابن صفی مقصد تھا۔ جس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے اور تصوف کے طریقوں میں انھوں نے ایک نیا نہج ایجاد کر دیا۔''

www.urduchannel.in

مذکورہ بالا اقتباس محض ایک اقتباس ہی نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف ہر کوئی کرے گا۔ ذرا غور تو کیجیے اور ابن صفی کے مشن کو سمجھنے کی کوشش کیجیے! یقیناً آپ کا دل بھی گواہی دے گا کہ ابن صفی کے ناول متعدد پہلوؤں پر مشتمل ہیں۔ یا ان کا کوئی مخصوص موضوع، فضا اور مقام وجغرافیہ نہیں بلکہ پوری دنیا اور سارا عالم ہی ان کا ہدف ہے۔

اسی طرح فراز ناصری تحریر کرتے ہیں:

''ابن صفی کے ناولوں میں ایک ایسی چیز ہے جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ وہ ہے روحانیت اور تصوف۔ حالاں کہ وہ 'کتاب تصوف' یا 'روحانیت' کا دفتر نہیں ہیں۔ اس کے باوجود ان میں یہ چیزیں موجود ہیں جن سے ان ناولوں کو سرسری طور پر پڑھنے والا بھی محروم نہیں رہتا اور گہرائی وسنجیدگی سے پڑھنے والا تو پل پل مالا مال ہوتا رہتا ہے۔''

عموماً ابن صفی (بی اے) کے ناولوں کو لوگ سامان تفریح، وقت گزاری کا دل چسپ مشغلہ، ٹائم پاس آئٹم یا سرسری طور پر پڑھے جانے والا میٹریل سمجھتے ہیں۔ جب کہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ ابن صفی کے ناولوں میں سماجی برائیوں اور معاشرتی خرابیوں کا گہرا کرب، ان کا اسباب وعلاج اور زندگی سے بھرپور فلسفہ موجود ہے۔ ابن صفی کی نظر سماج کی رستی رگوں پر تھی اور خون تھوکتے سماج ان کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ انھوں نے ان ہی کا علاج تلاش کیا یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول ہمارے سماج ومعاشرے سے ہم آہنگ ہیں۔ ابن صفی کے ناول اور ان کے کردار محض اپنا فرض ہی پورا نہیں کرتے بلکہ اپنی باتوں اور کارناموں سے حیات انسانی کو بھی زندگی بخشتے ہیں۔ میرے اس خیال کی تائید لئیق رضوی کے اس قول سے ہوتی ہے:

''ابن صفی نے، جاسوسی ناولوں کو بڑا وزن دیا ہے۔ انھیں زندگی کے فلسفے اور سماجی شعور سے جوڑا ہے۔ پراسرار اور سنسنی خیز وادیوں میں محض تفریحی ہچکولے کھلانے کے

بجائے انھوں نے عام طور پر قاری کی جرم پرت در پرت سچائیوں سے روبرو کرانے کی جستجو کی۔ تفتیش اور مجرم کی تلاش میں کھو جانے کے بجائے، وہ ان سوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو لگاتار جرم اور مجرم کو اگل رہے ہیں۔''

مذکورہ بالا اقتباس ہمارے معاشرتی سچ اور حقیقت کا جیتا جاگتا بیان ہے۔ یقیناً جرم اور مجرم ہمارے ہی معاشرے کی پیداوار ہیں اور یہیں وہ سوتے موجود ہیں جو ان عناصر کو اگلتے ہیں اور دنیا کا امن و امان غارت کر کے زمین کو فساد سے بھر دیتے ہیں۔ ابن صفی نے ایسے ہی سوتوں کی کھوج کی اور اپنے کرداروں کے ذریعے نہ صرف ان سوتوں کا سلسلہ رکوایا بلکہ حق کی باطل پر فتح اور انصاف و رواداری کی دغا، فریب و بنیاد پرستی پر جیت بھی درج کی۔ یہی ابن صفی کا کمال ہے اور یہی تقاضائے تصوف بھی۔ اس طرح اب مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ ابن صفی 20 ویں صدی کے ایسے صوفی تھے جن کی نہ کوئی خانقاہ تھی اور نہ دائرہ۔ نہ آستانہ تھا نہ چوبارہ، تاہم! ان کا 'سلسلہ' ضرور تھا جو تصوف کے سلاسل سے الگ تھلگ ضرور تھا اور حسب دستور طویل بھی۔ اتنا طویل کہ جس کی کوئی انتہا نہیں نیز آج تک اس میں وسعت ہوتی جارہی ہے۔ ان کی صوفیانہ تحریروں کے ہزاروں بلکہ لاکھوں، کروڑوں لوگ پڑھتے تھے۔ ان تحریروں کو پڑھ کر وہ قارئین اپنے دلوں میں ایسا سکون حاصل کرتے تھے جیسے انھیں نجات اور نروان مل گیا ہو جس کی انھیں صدیوں سے تلاش تھی اور جس کے لیے وہ قرنہا قرن سے پیاسے تھے۔ پیاسے سمندروں کی طرح جو طوفان مچا کر اپنی پیاس بجھانے کی آوازیں لگاتے رہتے ہیں۔

اک سمند رنے آواز دی!
مجھ کو پانی پلا دیجیے!!

ابن صفی کے ناولوں میں جا بجا یہ حقیقت ملے گی کہ ان کے کردار مادوں اور مادہ پرستی کے

www.urduchannel.in

مقابلے روحانیت کے مبلغ نظر آئیں گے۔ جب وہ کسی مہم پر روانہ ہوتے ہیں، یا غیر متوقع حالات میں گرفتار ہوتے ہیں تو ان کا ایمان خدا، رسول، بزرگان دین سے عقیدت وغیرہ یہ سرمائے ان کے بہت کام آتے ہیں۔ وہ اپنی قوت بازو پر ہی آنکھ بند کر کے بھروسہ نہیں کرتے۔ اسی اضافی داؤ سے انھوں نے جیرالڈ شاستری، ڈاکٹر نارنگ (ایم پی) سنگ ہی، ٹی تھری بی، ناصر مرزا وغیرہ جیسے ملکی و غیر ملکی ہزاروں سماج دشمن عناصر سے دیوانہ وار لڑ جاتے تھے---- اور معلوم ہے تجھے کبھی ناکام ہوئے؟

ابن صفی (بی اے) کے تمام کردار مثبت کردار تصوف کی چلتی پھرتی مثال تھے جن میں احمد کمال فریدی تو مجسم تصوف تھے۔ ان کی باتوں میں بلا کی فکر انگیزی اور سنجیدگی۔ صورت حال اور غیر متوقع کیفیات سے مقابلہ آرا ہونے کا انداز۔ دشمن کے ساتھ حسن سلوک۔ ملک و قوم کے تحفظ و بقا کے لیے 'غم دوراں کا ذرا سا بھی حق رکھنے والی سانسوں کو بھی رکھ چھوڑنا۔ ان کی صوفیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ جس میں کوئی شک نہیں اور نہ ہی یہ ایسا نظریہ ہے جو قابل تردید ہو۔

مآخذو مراجع

احمد بن حنبل۔ مسند احمد بن حنبل، ج5۔ مکتبہ بلال۔ دیوبند 1386ھ

صدیقی۔ معین الحق۔ اور بیاں میرا۔ جے پور۔ مکتبہ ابجد۔ 1986۔

ناصری۔ فراز۔ ناول، ناول نگاری اور ابن صفی۔ احمد آباد۔ سمر پریس۔ 1988

رضوی۔ لئیق۔ ابن صفی اور سماجی سروکار۔ نئی دہلی۔ کتاب نما۔ جولائی: 2010

✸ ✸ ✸

دلت فکشن کی نمایندہ پیش کش۔ 'تخم خوں'

یہ 1869 کے آس پاس کی بات ہے جب ڈپٹی نذیر احمد کا پہلا ناول 'مرأۃ العروس' منظر عام پر آیا۔ اس وقت خود مصنف تو کیا ساری دنیا اس بات سے ناواقف تھی کہ ناول نویسی کا یہ بیج ایک دن اس قدر تناور اور گھنا ہو جائے گا کہ اس کی شاخیں اور جڑیں اکناف عالم میں پھیل کر ضرورت زندگانی بن جائیں گی، کسی خود رو جھاڑی دار درخت کی مانند نہیں بلکہ سایہ دار اور فرحت رساں ہوا بخشنے والے پیڑ کی مانند۔ اردو زبان نے جیسے ناول نگاری کی صنف کو پایا، اسے گنج قارون مل گیا اور وہ مالا مال ہوگئی۔ اس کی ادبیات میں ایک شاندار اضافہ ہوا تھا یہ اور اس کے شبستانوں میں روشنیوں کا پیغام تھا یہ آغاز۔ بس پھر کیا تھا..... اردو زبان وادب کے شائقین نے روز اول سے ہی اس کی پذیرائی شروع کر دی اور جب مصنفین اور ناول نویسوں نے عوام کی جانب سے اس کے تئیں اس طرح کی گرم جوشی اور پرتپاک استقبال دیکھا تو وہ کیسے پیچھے رہتے۔ ایک سے بڑھ کر ایک ناول لکھا انھوں نے۔ زندگی، کاینات، طبقات، جغرافیوں، ممالک و امصار۔ تہذیب و کلچر، تمدن اور رہن سہن، بنیاد پرستی و خاندانی وجاہتوں، توہم پرستی و مذہبی استحصال۔ اعلا، متوسط و دلت سماجوں کے حالات و واقعات اور ان کے رہن سہن و طرز زندگی سے متعلق موضوعات پر مشتمل اردو

www.urduchannel.in

دنیا میں آنے والے ان ناولوں نے کہرام سا مچا دیا۔ پہلے یہ سلسلہ اجتماعی تھا، یعنی ایک ہی ناول میں حیات و کاینات، طرز زندگی اور تہذیب و تمدن اور عامۃ الناس کے جملہ مسائل ان میں بیان ہوتے تھے مگر جب یہ سیل رواں شبابیت اور تیز گامی سے چل پڑا تو اس میں سے خس و خاشاک اور الٹی سیدھی روایتوں کو نکال کر اسے صاف آئینہ بنانے والے نقاد و علما اور دانشور پیدا ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے کچھ خطوط متعین کیے اور ان ہی کی روشنی میں نویسوں اور نگاروں کو ہدایات دیں کہ وہ اب وقت کے تقاضوں کے مطابق ناول لکھیں۔ الگ الگ مسائل کو اپنے قلم، ذہن و فکر اور کینوس کا موضوع بنائیں۔ اگر آپ مصور ہیں تو آپ کی تصویر اس عہد، سماج، گلوب، کاینات اور عہد کا سچا بیان ہو۔ آپ اگر قلم کار ہیں تو آپ دنیا جہان کی باتوں پر غور و فکر کرنے کے بجائے اپنے سماج اور سوسائٹی کو اپنا موضوع بنائیں اور اس کی گلیوں، چوپالوں، بیٹھکوں، پنچائیتوں کے فیصلوں کو کوریج کریں۔ آپ اگر کسی کلچر سے وابستہ ہیں تو اس کی نمائندگی کریں۔ اگر کسی شہر کے باشندہ ہیں تو شہری مسائل، وہاں کی حصولیابیاں، محرومی اور انسانیت و رشتوں کی بُناوٹ و دراڑیں آپ کی تحریروں سے جھلکیں۔

نقادوں کی اس آواز پر سب سے پہلے منشی پریم چند نے لبیک کہا جب انھوں نے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ 'سوز وطن' (1907) شائع کیا تو دلت مسائل کی گونج اس قدر پورے ہندوستان میں مچی کہ حکومت ہند یعنی برطانوی ایمپاورمنٹ کو، 1909 میں اسے ضبط کر کے جلا دینا پڑا اور اس کی اشاعت پر ملک گیر پابندی عاید کر دی۔ ظالم پریس ایکٹ کے تحت اس پریس کی ضمانت بھی ضبط کر لی جس نے اسے چھاپا تھا۔ مگر وہ قلم کار ہی کیا جو شاہوں کے آگے جھک جائے، لہٰذا پریم چند نے 'اسرار معابد' (1903) 'ہم خرما و ہم ثواب' (1907) 'جلوہ ایثار'، 'گئو دان' (1936) جیسے شہ پارے لکھ کر نہ صرف حکومت کو دلت سماج اور عوام کے اندرونی مسائل سے واقف کرایا بلکہ اردو ادب میں دلت فکشن کا آغاز بھی

کر دیا۔ 'گئو دان' پریم چند کے فن کا نکتہ عروج ہے، جو دلت مسائل اور مشکلات کا بیان ہے۔

پریم چند کے بعد یہ روایت احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، دیوندر ستیارتھی، کرشن چندر اور ترقی پسندوں کے ایک بڑے گروہ نے اپنائی۔ انھوں نے نہ صرف اس ضمن میں یادگار اور شاہ کار افسانے لکھے بلکہ اردو ادب میں قابل قدر اضافہ کرنے والے ناول بھی ان کے قلم سے نکلے۔ پھر تو یہ سلسلہ چل پڑا جو آج تک جاری ہے اور آج بھی 'بھوپال گیس سانحہ' پر مشتمل 'آگ ...آگ' (1988) 'فائر ایریا' (1994) اور اب صغیر رحمانی کا ناول 'تخم خوں' (2016) یہ ایسے سلسلے ہیں جن میں آج کے ترقی یافتہ اور برق رفتار عہد میں بھی غریبوں و مزدوروں کے استحصال، پامالی، ان کی زندگی کی ارزانی اور ان کے وجود کی بے کاری کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جس طرح ان کا سرعام 'ہیومن رائٹس کمیشن'، 'حقوق انسانی اداروں' اور حکومت کی 'اینٹی ایکسپلائٹیشن اسکیموں' کے سامنے استحصال کیا جاتا ہے، نیز مذہبی ٹھیکے دار، گرو، افسر، پولیس، بڑے بول بولنے والے اور امیر جس طرح ان غریبوں کی عزت، جوانی، حسن و بدصورتی، طاقت اور حوصلے سے کھیلتے ہیں وہ ایک خوں چکا حکایت ہے۔ پہلا 'تخم خوں' یہیں سے بویا جاتا ہے جو بڑا ہو کر تکلیف دہ ببول کا درخت بن جاتا ہے، جس کا نہ سایہ کام کا اور نہ ہی پھلوں سے کسی کو آسودگی۔ مگر یہ سب ہوتا ہے اور آج بھی ہوتا ہے.....ہو رہا ہے.....نہ جانے کب تک ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہاں اگر کوئی 'مسیح'، غلطی سے پیدا بھی ہوتا ہے تو اسے سب سے پہلے وہی سولی پر چڑھاتے ہیں جن کے لیے وہ ساری دنیا سے لڑتا ہے اور انھیں 'نجات' 'نروان' دینا چاہتا ہے۔ پھر اس مسیح کے وجود کا کیا فائدہ، وہ بے چارہ تو جیتے جی ہی مر جاتا ہے۔ پھانسی تو اس کی مردہ لاش کو لگتی ہے۔ ایک ڈر سا بیٹھا ہوا ہے غریبوں

www.urduchannel.in

کے دل میں پولیس، سرکاری افسران، مذہبی گرو اور امیروں کا۔ کیوں کہ وہ خود کو خدا کا نمایندہ کہہ کر، اپنے آپ کو مخصوص سمجھا کر اور اپنی دولت و طاقت کا سہارا لے کر غریبوں کی سانسوں تک پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ پتا نہیں ساری دنیا کا یہ عالم ہے کہ نہیں، تاہم میں ہندوستان بھر کی سطح پر میں گارنٹی لے سکتا ہوں کہ یہاں شمال سے جنوب، مشرق سے مغرب، تمام سمتوں میں اسی نہج کو آج بھی برتا جا رہا ہے، حکومتیں اور انتظامیہ ان آدم خوروں کی پشت پناہی کرتے ہیں اور انھیں **'پیس'**، **'بیسٹ پرسن آف دی ائیر'** **'فخر ہندوستان'** جیسے **ایوارڈ** دے کر ان کی غنڈہ گردی کی تصدیق کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ ستم اور سوا ہو جاتا ہے جب انھیں ناہنجاروں کو 'راجیہ سبھا' جیسے مقدس ایوان کا ممبر بھی بنا دیا جاتا ہے۔

کیا خوب ہیں ہندوستان کے دیہات، پس ماندہ اور غیر آباد دیہات، غیر مہذب اور ناشایستہ دیہات، ایسا نہیں ہے کہ ان دیہات میں رہنے والوں کے جذبات نہیں ہوتے، احساسات سے انھیں آگاہی نہیں ہے اور نہ وہ تمنا، آرزو یا شوق پالنا جانتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انھیں سماج اور مذہب کے ٹھیکے داروں یا حکومت کے افسران و نوکروں نے اس طرح کے گورکھ دھندوں اور پابندیوں میں جکڑ کر رکھ دیا کہ وہ بے چارے لب تک کھولتے وقت کئی کئی بار سوچتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے محاورے بھی بنا رکھے ہیں **'پہلے تولو پھر بولو'**. اس سے کیا ہوگا بھئی؟ اس سے یہ ہوگا کہ آپ کی زبان کسی مذہبی ٹھیکے دار، مولوی پنڈت، کلکٹر یا افسر یا کسی امیر کے خلاف بولتے وقت پھسلے گی نہیں۔ جب کہ شہری باشندے شہر کی دیواروں پر ان سب طبقات کے خلاف اعلان نامے، مخالف پوسٹر اور اینٹی ہورڈنگس لگا کر بے خوف دندناتے پھرتے ہیں۔ یہ ایک فرق ہے دیہاتی اور شہری زندگی کا۔ دیہاتی زندگی کے تمام بڑے لوگ اور طبقات اپنے آپ کو 'گاؤں اور دیہاتوں

میں خدا کا اوتار مانتے اور کہلواتے ہیں' غریبوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کے 'چرنوں میں شیش جھکائیں' مخالفت اور حکم عدولی کی صورت میں ،ان کے لیے ان غریبوں کی عزت ،آبرو،خون،گھر،گھر والی،کھیتی باڑی اور دیگر اسباب زندگی حلال ہو جاتے ہیں اور اگر ان کی جی حضوری ہوتی رہی تو وہ کچھ وقت تک وہ متاع زندگی ان کے پاس رہتی ہے۔جو ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی،دبلی پتلی گائے بھینس،بیل،غیر اپجاؤ زمین وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے۔

دیہات کی زندگیوں کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ یہاں کے پنڈت،پروہت،مولوی اور امیر لوگ جب اپنے اپنے لوگوں میں پہنچتے ہیں تو ایک دوسرے کی اس قدر برائی بیان کرتے ہیں کہ ان کی نظر میں ان سے زیادہ شریر اور شر پسند جیسے کوئی ہے ہی نہیں اور جب جاہل و نافہم عوام لاٹھی،بھالا،بلم،بندوق،بم،اینٹ پتھر لے کر ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہیں اور جب ان کا گرم گرم لہو زمین کو رنگین کرتا ہے اس وقت یہ چاروں طبقے ایک ہی میز پر بیٹھ کر اس خون کی ہولی کا جشن مناتے ہیں۔پھر جب نشہ ہوا ہوتا ہے تو پنڈت جی کریا کرم کرنے، مولوی صاحب نماز جنازہ پڑھانے اور پرساد دینے،عزت مآب 'امیر گاؤں' مفت کی ہمدردی اور بھلائی لینے اور افسر علاقہ مگر مچھ والا افسوس جتانے پہنچ جاتے ہیں---- کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوتی کہ یہ 'گیم' کھیلا کس نے ہے اور ان دو چار، پانچ دس لاشوں کی ذمے داری کس کے سر ہے۔پھر پولیس آتی ہے۔اندھی....بے عقل اور بے رحم پولیس۔اسے پتا ہوتا ہے کہ اصل مجرم کون ہے پھر بھی وہ دشمن ٹیم ماضی کے گڑھے مردے اکھاڑ کر،معمولی کہا سنی اور آپسی کشیدگی کو مدعا بنا کر دو تین، پانچ دس معصوموں کو دھر دبوچتی ہے اور عدالت تک پہنچانے سے پہلے ہی انھیں سزاؤں اور عقوبتوں کے سخت ترین مراحل سے گزار کر ان کے کس بل نکال دیتی ہے۔جب وہ عدالت میں پیش کیے جاتے ہیں تو فاضل جج کا فیصلہ

www.urduchannel.in

سنانے سے پہلے ہی اپنا 'ناکردہ' جرم قبول کر لیتے ہیں۔پھر.....بیس سال کی سزا.....عمر قید بامشقت.....یا فاضل جج وعدالت دونوں انھیں پھانسی پر چڑھا دیتے ہیں۔لو بھئی فیصلہ ہو گیا۔نہ چونا لگا نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا ہی آیا۔

ناول 'تخم خوں' ایک ایسا ہی ناول ہے جس میں خاص طور پر بہار کے دیہات،وہاں کے طبقات،عوام،گاؤں اور بستیوں کی خراب صورت حال۔حکومت اور انتظامیہ کی ان کے تئیں مبینہ اور مجرمانہ سرد مہری وچشم پوشی،غریبوں کی زمینوں،محنتوں،عزتوں اور معصوم تمناؤں کا خون کرنے و ہڑپنے کی سازشیں۔دلت وغریب عوام کے گھریلو مسائل و پریشانیاں،ان میں پیدا ہونے والی اخلاقی کمزوریاں،ان کی مختلف قسم کی بیماریاں چاہے وہ مذہب کے عنوان سے ہوں یا کلچر کے نام پے،وبائی یا سیاسی امراض ہوں یا خود ان کے اپنے جسموں کے پھوڑے۔ناول نگار نے اس ناول میں وہ حقیقت دکھائی ہے کہ چشم بینا لہو رونے لگے اور قلب پرسکوں میں طوفان ہلچل مچا دیں۔

ناول کا آغاز ہماری داستانوں کے طرز پر ہوتا ہے.....مثلاً جیسے کوئی بادشاہ ہوتا تھا..... اس کے پاس اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہوتا تھا.....بس اس کے تاج وتخت کا ولی وارث نہیں ہوتا تھا کوئی.....بس یہی فکر اسے ہر وقت کھائے رہتی تھی اور یہ فکر اسے وقت سے پہلے بوڑھا بنا دیتی تھی.....پھر خدا کا کرنا ایسا ہوتا تھا کہ اس کے اولاد ہو جاتی ہے.....پھر شہر میں چراغاں ہوتے تھے .....غریبوں کی عیدیں ہوتیں.....امیروں کے گھروں میں پھلجھڑیاں رنگ بکھیرتیں.....مگر،اب نہ تو راجا ہیں اور نہ مہاراجہ،نہ بادشاہ ہیں نہ نواب،ہاں! مگر وہی عوام اب بھی باقی ہیں.....غریب عوام،بے بس عوام،اپنے دکھوں اور غموں سے اکیلے لڑتے عوام۔وہ تب بھی عوام تھے اور آج بھی عوام ہیں۔ہمیشہ عوام ہی رہیں گے۔

اب ان عوام کے مدتوں کے بعد کوئی لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ان کی زندگیوں میں بھی ایسا ہی انقلاب آتا ہے---- پھر وہ جشن مناتے ہیں جو اپنی حیثیت اور اوقات کے مطابق ہوتا ہے مگر وہ بھی کسی بادشاہ سے کسی طرح کم نہیں ہوتا.....اس کے بعد گاؤں کی رسوم وتوہم پرستانہ فضا کے مطابق زائچہ بینوں یعنی نجومیوں سے بچے کے مستقبل کے بارے میں باتیں۔ان کی بکواس اور غم گین کر دینے والی باتیں۔پھر اس کے بعد دیگر رسوم وراج اور الا بلا.....یہ گاؤں والے بھی خدا جانے کتنے تکلفات کرتے ہیں .....مگر لطف کی بات تو یہ ہے کہ یہ خرافات ان کی تہذیب ہیں۔ان کی شہہ رگ ہیں اور ان کے وجود کا اٹوٹ حصہ جن سے وہ کسی بھی قیمت پر الگ نہیں ہو سکتے اور نہ ہی انھیں کر سکتے ہیں۔عالم یہ ہے کہ اگر کسی گھر بستی یا گاؤں میں ان رسوم وخرافات کو نہیں اپنایا گیا تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی بہت بڑی کمی رہ گئی.....کوئی بہت بڑی بھول چوک ہوگئی۔کوئی خاص بات رہ گئی جو نہ ادا نہیں کی گئی۔

ناول کا یہ ڈرامائی سین دیکھنے کے بعد یعنی چند لمحوں کی خوشیاں حاصل ہونے کے بعد اب شروع ہوتا ہے اصل واقعہ.....ٹریجڈی بھری وارداتیں ....مشکل اور نا قابل بیان کلفتوں سے لبالب بھری زندگی۔گاؤں کے ایک ایک فرد کی بیماری اور پریشانی----- چنانچہ یہ سلسلہ ناول کے 13 ویں صفحے سے شروع ہوکر 351 ویں صفحے تک دراز ہوتا چلا جاتا ہے۔

'تخم خوں' ایک ایسا آئینہ ہے جس میں غریبوں، مزدوروں، جاہل دیہاتیوں اور عوام الناس کی تصویریں اس قدر صاف ہیں کہ انھیں معمولی نظر سے دیکھنے والا بھی ہل کر رہ جائے گا مگر جو آنکھ ہی بند کر لے یا اس کی پھوٹ گئی ہوں، اسے کچھ بھی نظر نہیں آسکتا۔کوئی ناول، داستان، افسانہ صرف اس لیے نہیں لکھا جاتا کہ پڑھنے والے صرف اس سے لطف اندوز ہوں اور واہ واکر کے رہ جائیں بلکہ ان الفاظ اور حروف میں چھپے مصنف کے کرب اور

www.urduchannel.in

پریشانی کی شناخت کرنا اصل مقصد ہے تاکہ وہ مصنف کی اس مہم کا حصہ بن جائیں جس کے ذریعے وہ اس صورت حال کو بدلتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔وہ اپنے انداز سے ان لوگوں تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہے جہاں سے منصوبے اور ایکشن پلان کیے جاتے ہیں۔'ادب برائے زندگی' کا یہی تو مطلب ہے۔یعنی زندگیوں میں اس ادب سے انقلاب آجائے۔ ورنہ 'ادب برائے ادب' تو ہر وقت ادب کا حصہ ہوتا ہے۔'ادب کا ادب' اتنا مفید ہر گز نہیں ہے جتنا اس کا 'زندگی' بن جانا ہوجاتا ہے۔لیکن کوئی سمجھے تب تو.....چنانچہ جو لوگ سمجھتے ہیں وہ صغیر رحمانی جیسا ناول لکھتے ہیں اور اپنا درد وکرب ان ایوانوں تک پہنچا دیتے ہیں جہاں سے گاؤں اور دیہاتوں کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں اور عوام الناس کی زندگی و موت کی سوداگری کی جاتی ہے۔

اس ناول میں دیہات میں بسنے والے غریبوں، محنت کشوں کی معصوم نفسیات کا انتہائی کامیاب انداز سے تجزیہ کیا گیا ہے۔نفسیات ہر انسان میں ہوتی ہیں، چاہے وہ شاہ زادہ ہو یا لیڈر پتر، غریب ہو یا چودھری کا بیٹا۔بزنس مین کا سن (son) ہو یا امیر زادہ۔مگر اصل نفسیات غریبوں کی ہوتی ہیں۔نہایت معصوم اور بناوٹ وتصنع سے یکسر عاری۔جیسے اس ناول کی بلایتی کی نفسیات ہیں:

ایسی تحریریں اب خال خال ہی نظر آتی ہیں جو عوام کی ترجمان بن کر حکومت وانتظامیہ کے عالی شان شبستانوں میں کھلبلی مچاتی ہیں.....اس کی وجوہات، اللہ جانے کیا ہیں۔مگر اس کا مطلب یہ تو ہر گز نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ظلم واستبداد اور سرکاری ستم زاریوں، اپنے و اپنے جیسے انسانوں کی استحصال اور کمر توڑ محنتوں و بیگار پر کچھ نہ کہیں.....کم سے کم انسان کو تو اتنا بے رحم ہر گز نہیں ہونا چاہیے---- 'تخم خوں' کا یہی پیغام ہے اور یہی صدا وفغاں کہ اب

ہمیں ظلم و ناانصافی کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا ہوگا اور اپنے سماج و طبقے کے کسی بھی فرد کے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دینا ہے اور نہ ہی اس کی عصمت وعزت کو نیلام ہونے دینا ہے۔ جو لوگ بڑے لوگوں سے ڈرتے ہیں .....سرکار اور انتظامیہ کی غلط کاریوں سے گھبراتے ہیں۔ مذہبی ٹھیکے داروں اور نام نہاد امیروں کے ہر عیب کو ہنر سمجھتے ہیں، انھیں اس عام غلط فہمی سے نکلنا ہوگا اور ہر ظلم و ناانصافی کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ انسانی جان اتنی سستی نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی ہمیں خود دوسرے کو یہ باور کرانا چاہیے کہ ہم کمزور ہیں اور ہمیں کوئی کس بھی طرح استعمال کرلے۔ چوں کہ یہ بات نہ تو شان انسانیت کے لیے مناسب ہے اور نہ ہی کسی مذہب میں ایسی گھٹیا تعلیم ہے۔ ہر انسان آزاد ہے، اسے کسی نے غلام نہیں پیدا کیا۔ وہ ازل سے ہی آزاد ہے، اسے جن طبقات، سماجوں اور مذہبوں نے غلام بنایا ہے وہ سب قابل گردن زدنی ہیں۔ ناول 'تخم خوں' اب زمانے میں یہی اعلان کرے گا اور خواب انا میں مدہوش افراد و طبقات کے کانوں پر آواز جرس بن کر گونجے گا۔ اس کے بعد دو صورتیں پیدا ہوں گی یا تو قیامت ہی برپا ہو جائے گی یا پھر انقلاب آجائے گا.....جس کی انسان کو صدیوں سے تلاش ہے اور اس کے لیے قدرت بھی بار بار اپنے چنندہ لوگوں کو رسول، نبی، اوتار، بیٹا اور نمایندہ بنا کر بھیجتی رہی۔ مگر افسوس، ان پیغمبران حق کو یا تو ان کے امور مفوضہ پورے سے ہونے سے پہلے ہی زمانہ نگل گیا یا قدرت نے مزید ان کی رسوائی نہ برداشت کرتے ہوئے انھیں اپنے پاس بلا لیا.....اب رہ گئے انسان.....صدیوں سے جس اندھیرے میں بھٹک رہے تھے، ان ہی میں بھٹکتے اور سر ٹکراتے۔ ان ہی تاریکیوں میں اپنی انانیت اور علویت کا پھٹا سا پرچم لے کر اپنی جھوٹی شان لے کر ان سیاہ ناکیوں میں سرگرداں پھر رہے ہیں جس کی سحر نہ جانے کب ہوگی۔ ہوگی بھی کہ نہیں!!

www.urduchannel.in

'تخم خوں' دلت ڈسکورس یا فکشن پر لکھا جانے والا نہ تو پہلا ناول ہے اور نہ ہی آخری تاہم اسے ایک اہم پڑاؤ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ ابھی تو اس راہ میں مزید مسائل پیدا ہوں گے اور دیہاتی عوام، غریب طبقات، رنگ و نسل اور ذات پات کی بنیادوں پر کچلے جائیں گے۔ سوال ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ جواب ہے: **عدم انقلاب**۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی!
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب!!

یا اسی طرح:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی!
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا!!

صغیر رحمانی کا یہ ناول اسی 'انقلاب' کا نقیب اور داعی ہے۔ اس کا لفظ لفظ اعلان نامہ ہے اور سطر سطر ظلم و ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔

ناول میں ناول نگاری کے منجملہ پانچوں اصول اور ضوابط کو اپنایا گیا ہے۔ پلاٹ بہت مضبوط اور عصر حاضر کا ایک سلگتا ہوا عنصر ہے۔ کردار، بلکہ تمام کردار اپنے ماحول، جغرافیے کام دھندے، زبان، بولی بھاشا، ذات پات، رہن سہن، رنگ، نسل، عہدہ و مرتبہ کے اعتبار سے مکمل اور مناسب مستعمل ہیں۔ اسلوب نہایت عمدہ، آسان فہم اور الجھاؤں سے مکمل پاک۔ جزئیات نگاری کا انداز اور عائلی و دیہاتی زندگی کے ایک ایک جز کے بیان نے اس ناول کے ماحول اور کرداروں کی زندگیوں کو ہمارے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ وہ جغرافیہ پورا پورا ہمارے نظروں کے سامنے آ گیا جہاں کے یہ قصے یا تمثیل ہیں۔ مقصد۔ مقصد اس کے

علاوہ کیا ہوسکتا ہے کہ اس طرح یہ انفرادی درد اجتماعی ہوجائے اور کبھی تو ان کی آنکھ کھلے جو اُن غریبوں کے ٹکڑوں، ٹیکس، اناج، سبزیوں، پھل اور ان کی محنت کی کمائی پر پل رہے ہیں اور وہ ان کے لیے اپنے عہدے، مرتبے، پوسٹ، کرسی و رتبہ کے اعتبار سے کچھ اچھا سوچ لیں اور ان غریبوں کی زندگیوں میں بھی خوشیوں بھرے دن آجائیں .....ان کی معصوم تمناؤں اور احساسات کو کبھی تو کھلی فضا ملے تاکہ یہ آسمانوں میں نہ صحیح زمین میں ہی اڑان بھر سکیں۔

یہ ناول ان طبقات اور سماجوں کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ ہے جو خود کو اس کائنات کا چنندہ فرد مانتے ہیں۔ مذہب کا سہارا لے کر اور اشلوک پڑھ پڑھ کر پاکھنڈ کرتے ہیں اور اسے پنیہ کا کام سمجھتے ہیں۔ مثلاً اسی ناول کا پنڈت کانا تیواری۔ صبح کے وقت نظریں جھکائے.... چھپتے چھپاتے اور اپنے آپ میں سماتے ہوئے پاٹھک جی کے گھر کی طرف جارہا تھا.....کہیں اس پر کسی دلت یا چمار کی نظر نہ پڑ جائے.....:

''وہ جلد سے جلد پاٹھک جی کے گھر پہنچ جانا چاہتے تھے، اس سے قبل کہ کسی کم ذات پر ان کی نظر پڑ جائے۔ (یا ان پر پڑ جائے ایک ہی بات ہے) ان کی گردن جھکی ہوئی تھی اور نظریں ان کے پیروں کے گرد سمٹ کر چل رہی تھیں۔ صبح کا وقت اور کسی کم ذات پر نظر پڑ جائے، ان کے کسی چرند پرند بھی نظر پڑ جائے تو پورا دن برباد۔''

کیوں بھئی! اگر پڑ بھی گئی تو کیا ہوجائے گا؟ کیا گھٹ اور گل کر گر جائے گا اس کے وجود سے؟ کیا کمی آجائے گی اس میں؟ کیا انسان منحوس ہے؟ مگر افسوس! یہ سوالات صدیوں سے محض سوالات ہی ہیں ان کا جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا.....ان سوالات نے ایک عظیم کائنات اور نظام کو لاجواب کر رکھا ہے۔ بھلا معصوم جانوروں کا کیا قصور؟ مگر اللہ اللہ! وہ بھی منحوس ان اعلا ذات کے لوگوں کے لیے .....افسوس! انھوں نے انسانوں کے بیچ

www.urduchannel.in

کتنی خلیج پیدا کردی۔ ہم دنیا جہان کی باتیں کرتے ہیں مگر یہاں تو اپنے ہی گھر میں فساد کی جڑیں موجود ہیں۔ کیسے انسانیت کا بھلا ہوسکتا ہے۔

اس کے بعد انتظامیہ کے افسران کی من مانیاں.....گاؤوں اور دیہاتوں کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھنے کی مذموم روایت۔ چنانچہ غریب باشندوں سے من مانی کرنا اور ان کی بھاوناؤں سے گھناؤنا کھیل کھیلنا۔ ان کی عصمتوں پر نیت گرانا اور ان کے گھروں کی عورتوں، لڑکیوں کو لونڈی سمجھنا۔ لالچ دے کر ان کی عصمتوں کی دھجیاں بکھیرنا۔

پھر گاؤں کی سیاست اور ٹھیکے داری کا گندا سلسلہ۔ اسے رنگ داری بھی کہہ سکتے ہیں۔ جہاں کہیں کسی نے ذرا سی مخالفت کی حاکم اسے اس کے گھر سمیت برباد کردیتا ہے۔ گاؤں اور دیہاتوں کے یہ وہ مسائل ہیں جو شاید ہی کبھی حل ہو پائیں۔ مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم خاموش ہوجائیں اور اپنے آواز اٹھانے کے فرض سے فرار کریں۔ ہر دور کا المیہ ہے یہ کہ غریب اور بے بس عوام دبتے، کچلتے اور برباد ہوتے آئے ہیں.....اور خدا دیکھتا رہتا ہے.....بلوائیوں اور قاتلوں کی پشت پناہی اور حمایت کرتا رہتا ہے۔ غریبوں کی بستیاں دھوں دھوں کر کے جلتی ہیں اور امیروں کے محل سرا اس روشنی سے جگمگاتے ہیں۔

یہ کامیاب ناول ان مسائل کو نہایت سنجیدگی سے لیتے ہوئے ان کا تعاقب کرتا ہے اور ان کی زد میں آنے والے بدقسمتوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ بلکہ مقدور بھر اس کی کوشش ہے کہ ان کے تمام غم، دکھ درد سمیٹ لے اور انھیں بدلے میں خوشیاں دے۔

ایک مقام پر 'کانا تیواری' اتنا مقدس بن جاتا ہے جیسے 'خدا کی کتاب' مگر اس کے دل کی خباثت 'بلایتی' کو مستقبل کا سامان بنا کر رکھ لیتی ہے اور جب اسے اپنا مقصد پورا کرنا ہوتا ہے وہ اس ٹرمپ کارڈ کو نہایت خوبصورتی سے استعمال کر لیتا ہے۔ یہی ہے غریب کا

انجام ۔وہ بڑے لوگوں کی باتوں کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔علاقے کا بی ڈی او اس کے 'ٹرمپ کارڈ' کو استعمال کر کے پھینک دیتا ہے اور بدلے میں کانا تیواری کو اس کی منہ مانگی مراد مل جاتی ہے وہ بھی ٹینگر رام کے نام پر------ کانا تیوار بڑا 'گیم' کھیلتا ہے۔صدیوں سے دبے کچلے انسان کو مالک بنا کر اس کی آڑ میں 'وہ گھناؤنا کام کرتا ہے کہ اگر اس کی ذات والوں کو پتا چل جائے تو اس کا حقہ پانی بند کر دیں۔

''لو اب تم مالک ہو گئے اور میں تمھارا نوکر....''

''کیسی بات کرتے ہیں مالک....؟ مالک تو آپ ہی رہیں گے... ہمارا جیون تو آپ کی سیوا کے لیے ہے۔ہم آپ کا یہ اپکار کبھی نہیں بھولیں گے مالک۔آپ کی وجہ سے ہی ای کام ہم کو ملا ہے۔''

''ارے اپکار کیسا ٹینگر....تم نے ہماری بڑی سیوا کی ہے۔اس لیے یہ تو میرا فرض تھا۔لیکن ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھنا' پنڈت جی نے کچھ سوچ کر کہا۔

'او کا مالک....؟' حکم سننے کے لیے ٹینگر سر سے پیر تک کان بن گیا تھا۔

'یہ بات کوئی نہ جان پائے کہ اس کاروبار کا حساب کتاب ہم دیکھتے ہیں....نہیں تو ہم کو ہماری ذات برادری والے اپنے سماج سے باہر کر دیں گے .....براہمن ہوں نا....ہڈی مانس کا کام کیسے کر سکتا ہوں....؟''

یہ اقتباس اس حقیقت کا بیان ہے جسے ہمیشہ سے مخفی رکھا جاتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو پاتی ۔یہ بڑے لوگ، ہوس کار لوگ، لالچی اور جاہ طلب لوگ، سب کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر کریں تو کیسے کریں۔اس کے لیے وہ مذہب کی آڑ لے کر کمزوروں اور غریبوں کو اپنی بساط کا مہرہ بناتے ہیں۔غریب آدمی کیا جانے اس سیاست اور ڈپلومیسی یا حرامی پن کو جو یہ لوگ جان بوجھ کر دن کے اجالے میں ان کے ساتھ کھیلتے ہیں اور اس طرح کھیلتے ہیں کہ کوئی انھیں پکڑ بھی نہیں سکتا۔چنانچہ ٹینگر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔اسے پولیس پکڑ کر لے گئی۔

www.urduchannel.in

اسے سرعام چمارٹولے میں رسوا کر گئی۔اس کی بیوی بلایتی کو روتا اور بلکتا چھوڑ گئی اور پنڈت کانا تیواری شاید اس وقت چین کی بانسری بجا رہا ہو گا کہیں کرشن کنہیا کی مورت کے سامنے۔ایسا تو ممکن ہی نہیں کہ اسے اس گرفتاری کا علم نہ ہو گا۔چوں کہ گاؤں میں ہر چھوٹی بڑی بات کا پتا سب سے پہلے 'اونچے' لوگوں کو ہوتا ہے۔

کوئی جانے یا نہ جانے مگر ٹینگر اس حقیقت کو بہ خوبی جان گیا کہ اس کی گرفتاری، اس کی رسوائی اور اس کی جگ ہنسائی کے پیچھے ضرور پنڈت جی مہاراج کا ہاتھ ہے۔تبھی تو ایک ایسا سوال داغتا ہے جس سے پنڈت جی اپنی تمام مہاراجیت، تقدیس، عظمت، بلندی، مرتبے اور وقار سمیت گر جاتے ہیں۔

''مالک ایگو بات پوچھیں .....؟'' جانے کتنے دنوں بعد آج ٹینگر کے منہ سے بول پھوٹے۔بول (بھی) ایسے جیسے ان میں زنگ لگا ہو۔

پنڈت جی اس کا چہرہ تکنے لگے.....وہ سر خم کیے رہا۔

'مالک ....آپ کے جناور کیسے بچے رہ گئے مالک.....؟'' کھر کھر کرتی زنگ آلود آواز۔پنڈت جی کی پیشانی سکڑ گئی ساتھ میں آنکھیں بھی۔

''بیماری میں مالک ایک ایک جناور اینٹھ گئے.....پھر مالک آپ کے جناور.....؟''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔بیچ میں پنڈت جی نے لپک لیا۔

''میرے جانور کیسے اینٹھ جاتے.....؟ میں نے انھیں ٹیکے جو لگوائے تھے۔.....اور تُو کہنا کیا چاہتا ہے.....؟ پنڈت جی تلملا اٹھے 'تیری بدھی میں یہ بات آئی کیسے؟' تجھے یاد نہیں سب سے پہلے بیماری میری ہی بھینس کو لگی تھی جسے تو نے ہی جبّار میاں کے یہاں پہنچایا تھا....میری نظر تو اسی وقت بھانپ گئی تھی کہ یہ بیماری پھیلے گی.....میں نے بلاک کا بھروسہ نہیں کیا، ضلع جا کر ٹیکے لے آیا..... پوچھ لے ناچھورنا سے....

جب پاکھنڈی پنڈت اس طرح کی ایمان اور اعتبار شکن باتیں کرنے لگا تو کون ایمان

دار اور غیرت مند تھا جو وہاں رُکتا۔ چنانچہ ٹینگر بھی اٹھ آیا اور پنڈت وچھورنا اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ اس اقتباس میں دیکھیے پنڈت جی نے ساری دنیا کے جانور مارنے کے لیے کیسی گھناؤنی سازش رچی تا کہ اس کا ہڈیوں کا کاروبار خوب پھلے پھولے۔ پہلے اپنی ہی بھینس ماردی.... پھر دوسروں کے جانوروں پر عتاب برسایا۔ تیسری بات یہ کہ 'بلاک' کے دوا کھانے کا اعتبار نہ کر کے 'ضلع اسپتال' سے ٹیکے لے آیا۔ یہ امتیاز، یہ تفریق، یہ بھید بھاؤ کیسا؟ مگر ان بڑے لوگوں سے یہ سوال کون کرے اور کون ان کے گریبان پکڑے گا۔ ٹینگر اور مجھ جیسے کتنے ہی لوگ آجائیں ان ظالموں سے ان سوالوں کا جواب ملنا ممکن نہیں ہے۔

پاگل حکومتیں اور حکمران آج بسے بسائے، آباد اور گھنے شہروں کو 'اسمارٹ سٹی' بنانے کی مہم چلا رہے ہیں اور بڑے پیمانے پر لوگوں کو سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں۔ حالاں کہ اگر اسمارٹ بنانا تھا تو گاؤوں اور دیہاتوں کو بنایا جاتا، وہاں شہروں سے زیادہ تباہی اور بربادی ہے، وہاں زیادہ ضروریات ہیں، وہاں کے لوگ 'ترقیات' نام کی کسی چڑیا سے بھی واقف نہیں ہیں شہروں میں تو یہ چلتا ہی رہتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ گاؤوں کو خط افلاس اور غربت سے بلند کرتے، وہاں کے باشندوں کے مسائل کو حل کر کے انھیں سکون اور آرام پہنچایا جاتا، دوسرے لفظوں میں گاؤوں کو 'اسمارٹ' بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کے سو کولڈ بڑے لوگوں کو ان کے عہدوں سے محروم کر کے انھیں یکساں انسانی دھارے میں لایا جاتا۔ تا کہ انھیں بھی تو پتا چلتا کہ غریب بننے، بنانے اور ہونے کی کلفتیں کیا کیا ہیں..... مگر اس کے برخلاف افسوس ناک امر تو یہ ہے کہ وہ تو وہ..... ان کے معذور، اپاہج، بدصورت، بد ہیئت، بے سروتال کی نسلوں کو بھی لوگ ایسا ہی معظم، محترم، عزت مآب، عزیز القدر اور بھی نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں۔ جیسے اسی ناول کے پنڈت کانا تیواری کا تو تلا و ہکلا لڑکا 'من جی

www.urduchannel.in

بابا'------ مصنف نے کیا شان دار تبصرہ کیا ہے، جو پڑھنے کی چیز ہے:

''ہمارا معاشرے مرے ہوئے ہاتھی کی قیمت بھی سوا لاکھ لگاتا ہے۔ براہمن پتر خواہ سارے عیبوں سے بھرا ہوا ہو، مگر سماج میں اس کا مقام دیوتا کا ہی ہوتا ہے۔ براہمن پتر من جی بابا تھے تو پیدائشی معذور۔ ذہنی طور پر اور جسمانی طور پر بھی لیکن تھے تو وہ براہمن پتر، اس لیے وہ دیوتا روپ تھے اور اس کے مطابق 'مان سمان' حاصل کرنا ان کے پیدائشی حقوق میں شامل تھا۔''

یہ ہے اس 'براہمن پتر من جی بابا' کا ایک مختصر سا حلیہ۔ اس کے دیگر کارنامے تو ناول پڑھ کر ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اونٹ کی بھی کوئی نہ کوئی کل سیدھی ہوتی ہے مگر 'من جی بابا' کی کوئی کل سیدھی ہی نہیں تھی۔

مجھے اس 'براہمن پتر' کی توہین کرنے کا پورے حق ہے۔ چوں کہ میں 'انسانی تفریق' کی تعلیم دینے والے مذہب، ریاست، ٹیروٹوری اور ملک کا باغی ہوں۔ ممکن ہے کہ میری اس گستاخی کے سبب ان مقامات پر میرا داخلہ ممنوع کر دیا جائے، میری بلا سے، مگر میں اپنی آخری سانس تک انھیں برا بھلا کہتا رہوں گا۔ نہ میں کسی انسان سے بالا ہوں اور نہ ہی کوئی مجھ سے۔ بس ہم سب یکساں ہیں، اس زیست تک۔ ہاں! ہماری تکریم کا انحصار 'تقوا' پر ضرور ہے، مگر اس کا مطلب یہ کہاں ہے کہ اگر ہم متقی کے گھر پیدا ہوئے ہیں تو سات نسلوں تک ہم متقی ہی رہیں گے اور کوئی ہمارے بارے میں اس لیے نہیں بولے گا کہ ہم بڑے خاندان سے ہیں ہمارا تعلق گاؤں کے 'پوجیہ گھرانے' سے ہے۔ نہیں ہرگز نہیں!! لہٰذا جو لوگ اس خام خیالی میں آج تک مبتلا ہیں کہ 'ہم بھی من جی بابا' کی طرح معبود و مسجود بنیں گے، وہ اس سے باہر نکلیں اور وقت کی اس دھار کو دیکھیں جس نے عالی مرتبت لوگوں کی ہستی کو مٹی میں ملا دیا۔

عصر موجود میں گاؤوں کی صورتوں پر ترس کھانا، افسوس کرنا اور ان کی ترقی و فلاح کے

منصوبے بنانا شہروں کی پکی دیواروں میں 'ٹائلس' اور 'مکرانہ چپس' لگانے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ دیش کی ترقی کا اصل راز یہی ہے اور یہیں سے ملک گیر ترقی کا بیج بویا جاتا ہے۔

مجموعی طور پر تخم خوں بہت اچھا اور دل چسپ ناول ہے۔ چشم کشا بھی اور امید افزا بھی۔ اس میں ہمارے سماج بالخصوص دلت سماج کے وہ گندے حقائق ہیں جنھیں آئینہ دکھانے کی سخت ضرورت ہے اور یہ ناول یہ کام بخوبی انجام دے گا۔

رحمانی۔ صغیر۔ تخم خوں (ناول)۔ دہلی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ 2016

* * *

www.urduchannel.in

حکایات سعدی کی ادبی اہمیت

ارسطو و افلاطون و دیگر حکما و فلاسفران یونان، کے علاوہ بھی دنیا میں ایسے شناور اور حکمت وتدبر والے افراد پیدا ہوئے ہیں جن کے علوم و معارف اور عرفان سے آج بھی دنیا مستفیض ہو رہی اور رہتی دنیا تک ان کا فیض یوں ہی عام ہوتا رہے گا۔ بلکہ ہر نئے عہد میں ان سے نئے معانی و مطالب اخذ کر کے دستور حیات کے خطوط متعین کیے جاتے رہیں گے اور ان سے راہ زندگی میں روشنی حاصل کی جاتی رہے گی۔

مولانا روم، حافظ شیرازی اور شیخ سعدی اس جماعت کے سرخیل اور پیش رَو ہیں جن کے یہاں ایک طرف افکار عالم تھے دوسری طرف اللہ و رسول کی محبت و اطاعت کا فیضان بھی تھا۔ ایک طرف جہاں وہ علوم اسلامی کو ترویج و اشاعت بخش رہے تھے تو دوسری طرف وہ ادبیات عالم میں بیش بہا اضافے بھی کر رہے تھے اور دنیا بھر کے اسکالروں و دانش وروں کو اندرون خانۂ دل سے ایسے ایسے جواہر پارے نکال نکال کر دے رہے ہیں جن سے آج ان کے دبستان روشن و تاباں ہیں۔ ان کے کلام و افکار میں نرا فلسفہ ہی نہیں ہوتا ہے، اس سے بڑھ کر اس فکر و فلسفے کے وجود و ایجاد کی کہانی بھی ہوتی ہے۔ یعنی بات پوری طرح

سے سمجھانے کی کوشش اور حقیقت کا سچا بیان۔ شیخ سعدی شیرازی کی ہی بات لے لیں۔ ان کی معرکۃ الآرا اور مشہور زمانہ 'بوستان' و 'گلستان'، 'کریمہ سعدی' اور دیگر مختصر رسائل و کتب جہاں آداب زندگانی، فلسفۂ حیات، کاینات و جہاں کے اسرار و حکم اور فوائد سے بھری ہوئی ہیں وہیں انھوں نے ادبی شان بھی بلند رکھی ہے۔ ان میں وہی اسلوب اور طرز اپنایا گیا ہے اور ان کی بُناوٹ ان ہی خطوط پر ہوئی ہے جن پر اچھے ادب کی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی بات ہے کہ ان افکار کا فارسی سے اردو میں ترجمہ ہوجانے کے بعد تو اردو ادب کے سرمائے میں بھی عظیم الشان اور باوقار اضافہ ہوگیا۔

'بوستان سعدی' (سال تصنیف: 1257) و 'گلستان سعدی' (سال تصنیف: 1258) وہ کتابیں ہیں، جن کی اہمیت سے ہر شخص واقف ہے۔ انھیں آج بھی ساری دنیا میں تدریس اور ٹیچنگ کے طور پر پڑھا جاتا ہے اور ان سے سبق حاصل کیا جاتا ہے۔ ان سے زندگی کے گر سیکھے جاتے ہیں اور میدان عمل میں کامیابی کے ہنر جانے جاتے ہیں۔ حالاں کہ ان کی تصنیف و تالیف کو کئی صدیاں گزر گئیں مگر آج تک ان کی چمک دمک پھیکی نہیں پڑی اور نہ ان کی اثر پذیری میں کسی قسم کی کمی آئی ہے۔ الغرض ان کی آفاقی اہمیت و عظمت اور افادیت اسی طرح مسلّم ہے جیسی پہلے دن تھی۔ ان کا اثر اب بھی دلوں میں موجود ہے۔ خاص طور سے 'گلستان سعدی' کی مختصر مختصر حکایات اور ان میں پنہاں بڑے بڑے سبق یہ سب خاصے کی چیزیں ہیں۔ پڑھنے والا انھیں بار بار پڑھتا ہے اور ہر بار نیا سبق و نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ شیخ سعدی شیرازی کی ادبی، فکری اور دانشورانہ صلاحیتوں کا یہ کرشمہ تھا کہ اگلے وقتوں میں دنیا کے کروڑوں طالب علموں اور فارسی زبان پڑھنے والوں کی تعلیم اور زبان دانی 'گلستان' اور 'بوستان' کے بغیر ادھوری تصور کی جاتی تھی۔ یہ دو کتابیں ہزاروں علما کے حافظے میں حرف بہ حرف محفوظ تھیں اور آج بھی شیخ سعدی کے نثری جملے اور اشعار

www.urduchannel.in

بطورِ ضرب الامثال پیش کیے جاتے ہیں۔ نیز یہ اشعار اور یہ جملے، عرب و عجم میں زبان زدِ عام و خاص ہیں۔ ادبا انھیں اس لیے پڑھتے ہیں کہ ان کا ادبی مقام بہت بلند ہے، ان میں ادبی باریکیاں اور حسن ادب نیز اسلوب بیاں موجود ہے۔ طلبا اس لیے پڑھتے ہیں کہ ان کی زندگی کی تعمیر نو اور تربیت میں وہ معاون و مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ حکما اس لیے پڑھتے ہیں کہ ان کی باتوں میں ان سے نیا وژن پیدا ہوتا ہے۔ نکتہ رس ان میں نکات تلاش کرتے ہیں غرض ہر طبقے کا فرد اپنے اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق ان سے استفادہ کرتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شیخ سعدی نے ان جواہر پاروں کو پوری دنیا گھوم کر جمع کیا تھا۔ بہت بڑا جہان انھوں نے دیکھا تھا اور بہت بڑے بڑے تجربات سے وہ ہو کر گزرے تھے۔ ظاہر ہے ان کی باتوں میں ایسا اثر تو آنا ہی تھا، جو آیا اور جو اس کے جلو میں آیا وہ اس کی تاثیر میں آج تک گرفتار ہے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

در اَقصائے عالم بِگشتم بسے
بسر بردم ایّام باہر کسے
تمتّع زہر گوشۂ یافتم
ز ہر خرمنے خوشۂ یافتم

ترجمہ: میں دنیا کے اطراف و اکناف میں بہت گھوما پھرا۔ ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ میں نے وقت گزارا۔ میں نے ہر گوشے سے فائدہ اٹھایا اور ہر انبار سے خوشہ چنا۔

'حکایات سعدی' کے ادبی مقام و مرتبہ کے تعلق سے اگر بات کی جائے تو بلا تامل یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ عظیم ادبی سرمایہ ہیں۔ ان کا لفظ لفظ ادبیت و فن کاری سے مملو ہے اور اعلا ادب ان سے ہویدا ہوتا ہے۔ مثلاً یہ حکایت ملاحظہ فرمائیں:

''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک دیہاتی کا گدھا مر گیا تو اس نے اپنے باغ کو نظر بد سے

بچانے کے لیے گدھے کا سر ایک بیل کی شاخ پر لٹکا دیا۔ کوئی بوڑھا تجربہ کار شخص وہاں سے گزرا تو گدھے کا سر لٹکا دیکھ کر حیرانگی سے بولا: 'کیا خیال ہے کیا وہ گدھا نظر بد کو روک سکتا ہے جو اپنی پشت پر برسنے والے ڈنڈوں کو نہ روک سکا یہاں تک کہ وہ مار کھا کھا کر خود مر گیا۔ وہ طبیب کسی کو تکلیف سے کیا بچائے گا جو خود تکلیف اور مرض سے مر رہا ہو۔''

یہ حکایت ادبی اور فنی لحاظ سے ایک کامل حکایت ہے، انداز بیان ادیبانہ اور فن کارانہ ہے۔ اس میں کہیں سے بھی ایسا نہیں لگتا کہ سرسری طور پر کوئی بات کہہ دی گئی ہو بلکہ نہایت خوش اسلوبی سے اس کی بُناوٹ ہوئی ہے۔ شیخ سعدی کی ان حکایات کا انتخاب بھی بذات خود ان کی ادبی شان کی دلالت ہے۔ چنانچہ ذیل کی حکایت ملاحظہ فرمائیں:

''ایک کمزور ماہی گیر کے جال میں ایک طاقت ور مچھلی پھنس گئی۔ ماہی گیر میں اتنی طاقت نہ تھی کہ جال پانی سے کھینچ سکے۔ مچھلی نے زور مارا تو جال اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، وہی جال ہر بار مچھلی لاتا تھا اس بار تو مچھلی ہی جال لے گئی۔

اس معاملے پر دوسرے ماہی گیروں کو افسوس ہوا تو وہ اس ماہی گیر کو ملامت کرنے لگے کہ ایسا شکار تیرے جال میں پھنسا اور تو اس کو تھام نہ سکا۔ اس نے کہا کہ: 'اے بھائیو! میں کیا کر سکتا تھا جب مچھلی میرا رزق نہ تھی اور مچھلی کا رزق ابھی باقی تھا۔''

ایک حکایت۔ ایک ادبی شاہ کار، شیخ سعدی کی فن کاری کا ایک اور نمونہ۔ ایک اچھی اور علمی تمثیل۔ یہ حکایت بھی اسی قبیل کی ہے:

''ایک دفعہ شام کے ایک شہر میں کہرام برپا ہو گیا تو لوگوں سے اس کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ سپاہی ایک زاہد کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ اس مرد حق سے قید خانے میں ملنے گیا تو دیکھا کہ وہ نہایت اطمینان سے بیٹھا ہے اور اس کے چہرے پر ملال یا تردد کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آپ اس قدر مطمئن کیوں ہیں؟ اس نے کہا کہ خواہ عزت اور مرتبہ ہو یا ذلت اور قید، اسے اللہ کی طرف سے سمجھتا ہوں نہ کہ عمرو زید کی طرف سے۔''

www.urduchannel.in

یہ حکایت اپنی بناوٹ، پلاٹ، اسلوب اور کردار نگاری کے اعتبار سے بہت شاندار اور مکمل ہے۔ ایسا اسلوب کبھی کبھی بہت بڑی بڑی کہانیوں، داستانوں اور تخلیقات میں ملتا ہے مگر حکایات سعدی کے مختصر فن پاروں میں ہی یہ خوبیاں مل جاتی ہیں۔ اسی قسم کی ایک اور حکایت درج ہے:

''کریم الدین نامی ایک آدمی بڑا دولت مند اور عزت دار تھا۔ وہ غریب بستی میں رہتا تھا اور ارد گرد میں غریبوں کی آبادی تھی، تھوڑا بہت سرمایہ اسی کریم الدین کے پاس ہی تھا۔ وہاں ایک عورت اپنے خاوند سے لڑ پڑی، اس کا شوہر رات کو خالی ہاتھ لوٹا تھا۔ وہ بولی تیرے جیسا بد بخت آدمی میں نے نہیں دیکھا، تیرے پاس محرومی کے سوا کیا رکھا ہے؟ کچھ نہیں تو ہمسایوں سے سیکھ لے کہ وہ کس طرح مال کماتے ہیں تو بھی اس طرح کما۔ میں تیرے لیے مفت کی رنڈی نہیں ہوں، لوگوں کے پاس روپیہ، پیسہ اور مال ہے تم ان کی طرح کیوں نہیں بنتے ہو۔

یہ لعن طعن سن کر وہ سادہ دل شوہر صرف آہ بھر کر رہ گیا۔ بھلا خالی پیٹ سے دھوئیں کے سوا اور کیا نکلے گا۔ اگر مقدر اپنے اختیار میں نہیں ہے تو اسے بدلنے کی کوشش سے کیا ہوگا؟ زبردستی تو یہ کام نہیں ہوتا۔''

یہ حکایت قدرے طویل ہے مگر اس میں الجھن اور ذو معنی جیسی کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی کسی نا قابل فہم فلسفیانہ خیال کو اس میں بیان کیا گیا ہے بلکہ نہایت آسان اور سادہ انداز میں ساری باتیں کہہ دی گئیں۔ انھیں ہر کوئی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے نیز یہ سطح ادب سے بھی گری باتیں نہیں ہیں بلکہ ادب عالیہ جیسے افکار اس میں سموئے ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا شیخ سعدی شیرازی کی یہ حکایت اور اس جیسی تمام حکایتیں وہ ہیں جن کی نہ صرف اخلاقی، قدری، سماجی اور معاشرتی اہمیت ہے بلکہ ان کی ادبی حیثیت و اہمیت جداگانہ مقام رکھتی ہے۔ یہ دہری خوبی ان ہی کے حصے میں آئی ہے۔ یہ حکایتیں چاہے مختصر ہوں یا

طویل، اُن خصوصیات کی حامل ہیں جنھیں ادبی کہا جاتا ہے اور جن کی روشنی میں فن پاروں کی پرکھ وشناخت ہوتی ہے۔ اسی قسم کی ایک اور حکایت دیکھیے:

''سلطان محمود غزنوی اپنے غلام ایاز پر اس قدر مہربان تھا کہ اسے اپنا وزیر بنا لیا۔ دوسرے درباری حسد کے مارے انگاروں پے لوٹنے لگے اور ایاز کے خلاف طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ سلطان کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک پڑی تو اس نے کہا کہ ان کو ایاز کی خوبیاں معلوم نہیں ہیں۔

چند دنوں بعد سلطان، ایاز اور دوسرے ارکان دولت کے ساتھ کسی جگہ روانہ ہوا۔ راستے میں اس نے موتیوں کا صندوق گھوڑے سے گرادیا۔ صندوق ٹوٹ گیا اور سارے موتی زمین پر بکھر گئے۔ سلطان نے حکم دیا کہ جس کا دل چاہے وہ موتی لوٹ لے، پھر وہاں سے فوراً ہٹ گیا۔ تمام درباری موتیوں کی لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے جب کہ ایاز نے موتیوں کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا اور سلطان کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ اب ان حاسدوں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ سلطان ایاز کو کیوں محبوب رکھتا ہے اور کیوں اسے دولت وحکومت میں اتنا بلند عہدہ دیا ہے۔''

یہ ایک تاریخی نوعیت حکایت ہے۔ اس کا اسلوب بھی بہت عمدہ اور جاذب نظر ہے۔ اردو کی داستانوں کا سا رنگ وآہنگ اس میں موجود ہے اور ایسا ہی فسانہ بھی کہ کسی ملک میں کوئی بادشاہ تھا، وہ کچھ لوگوں کو اپنا قریبی رکھتا تھا، جس کے باعث دوسرے درباری ان سے ناراض ہو جاتے ہیں، پھر بادشاہ سلامت ان ناراض ارکان پر اپنے پسندیدہ ارکان کی اہمیت اجاگر کرنے کے بہانے تلاش کرتے ہیں بالآخر ان کی اہمیت وعظمت اور بادشاہ کا حسن انتخاب ان کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ ہمارا ادب، داستانیں اور حکایتیں، اس قسم کی کہانیوں اور تمثیلوں سے بھری ہوئی ہیں۔

اچھوتے اسلوب، بہترین جزیات نگاری اور عمدہ انداز بیاں، پلاٹ وکرداروں والی

www.urduchannel.in

یوسف زلیخا کے فسانۂ عشق پر مبنی ایک حکایت ملاحظہ فرمائیں جس سے اندازہ ہوگا کہ 'حکایات سعدی' تاریخی ادبی اور فنی لحاظ سے عظیم الشان اہمیت کی حامل ہیں۔ فرماتے ہیں:

''زلیخا نے عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر حضرت یوسف کا دامن پکڑا اور برائی پر حاوی ہو گئی اور اس نے بھیڑیے کی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو دبوچ لیا۔ زلیخا کے پاس سنگ مرمر کا ایک بت تھا جس کی وہ صبح وشام پوجا کرتی تھی۔ اس دست درازی کے وقت زلیخا نے اس بت کو ڈھانپ دیا تھا تاکہ وہ اس عمل بد کو نہ دیکھ سکے۔ اس نازک صورت حال کو دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام اداس ہو کر سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

زلیخا نے آپ کو ساکت حالت میں دیکھا تو قریب آکر آپ کے ہاتھ پاؤں چومنے لگی اور کہنے لگی کہ 'اے بے وفا! یہ تنہائی کا بہترین وقت ہے، تو اس شاندار وقت کو بے کار سوچ و بچار میں ضائع نہ کر، آگے بڑھ اور میری دلی مراد پوری کر دے۔ یہ سن کر حضرت یوسف علیہ السلام رونے لگے اور فرمایا کہ دور ہو جا۔ مجھ سے ایسی بدکاری کی توقع نہ رکھ، تجھے اس پتھر سے تو شرم آتی ہے جسے تو نے پردے سے ڈھانپ دیا، مجھے علیم وخبر اللہ سے شرم آتی ہے جو پردوں کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہے۔''

'حکایات سعدی' میں سے مذکورہ بالا حکایت، ایک مکمل اور سبق آموز داستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں پند ونصائح، اسرار ورموز اور پر حکمت باتیں ہیں۔ یعنی وہ سب باتیں جن کی ادب عالیہ اور صالح لٹریچر سے توقع کی جاتی ہے۔ اس طرح سے یہ حکایت بذات خود ادبی شان واہمیت کی حامل حکایت ہے۔ نیز اس کے افکار ادب وفن کے نکات سے لبریز ہیں۔ اس طرح کی ایک اور حکایت دیکھیں جو ادب کی شان بلند کرتی ہے اور 'حکایات سعدی' کی ادبی اہمیت کا احساس ادبی دنیا میں جاگزیں کرتی ہے:

''ایک دفعہ حضرت سعدی کشتی میں دریائی سفر کر رہے تھے، ان کی کشتی کے پیچھے ایک اور کشتی آرہی تھی جس میں کچھ مسافر سوار تھے۔ اتفاق سے وہ کشتی بھنور میں پھنس کر الٹ

گئی، مسافر غوطے کھانے لگے۔ان میں دو سگے بھائی بھی تھے۔ایک امیر آدمی نے اس کشتی کے ملاح سے کہا جس میں حضرت سعدی بھی سوار تھے کہ اگر تو ڈوبنے والوں کو بچالے تو میں تجھے منہ مانگا انعام دوں گا۔انعام کا سنتے ہی ملاح نے دریا میں چھلانگ لگادی اور دونوں سگے بھائیوں میں سے ایک کو بچالیا۔دوسرا ڈوب گیا۔حضرت سعدی نے ملاح سے کہا: اس کی عمر ہی باقی نہ رہی تھی اس لیے کہ تجھ سے نکالنے میں تاخیر ہوگئی۔

ملاح نے ہنس کر کہا جواب دیا کہ یہ بات سچ ہے لیکن اسے بچانے کی میری اپنی خواہش بھی نہیں تھی جس کی وجہ یہ ہے کہ بہت دنوں پہلے میں جنگل میں سفر کرتے ہوئے تھک کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔اتفاقاً یہ دونوں بھائی اونٹ پر سوار ادھر سے گزرے۔جس کو میں نے بچالیا ہے اس نے مجھے تھکا ماندہ دیکھ کر اونٹ پر سوار کرلیا تھا۔لہٰذا اس کو بچالیا کہ یہ میرا محسن ہے۔اس نے مجھ پر احسان کیا تھا۔لیکن دوسرے بھائی نے مجھے کوڑا مارا تھا اسے ڈوبتا دیکھ کر مجھے وہ بات یاد آ گئی تھی لہٰذا اسے میں نے ڈوبنے دیا۔

ملاح کی یہ بات سن کر حضرت سعدی نے دل میں کہا سچ ہے انسان اپنے کیے کی سزا پاتا ہے۔جو بوتا ہے وہ کاٹتا ہے۔جیسا عمل کرتا ہے ویسا اسے پھل بھی ملتا ہے۔اللہ پاک نے قرآن کریم میں یہی فرمایا ہے:

'جس نے نیک عمل کیا اپنے نفس کے لیے کیا اور جس نے برائی کی اپنے نفس کے لیے کی۔''

یہ حکایت اپنے مجموعی اسلوب و آہنگ کے طور پر ادب عالیہ کی شان اور قد بلند کرنے والی حکایت ہے۔اس کا اسلوب بیان نہایت اچھوتا اور عام ڈگر سے ہٹ کر ہے۔یہ ایک تمثیلی حکایت ہے۔آسان لفظیات کے ساتھ ساتھ اس کے جزیات میں بھی ندرت اور نیا پن ہے۔جس طرح بڑے ادب کے لوازمات ہوتے ہیں اس کے بھی ہیں۔

یہ حکایت بھی اسی قبیل کی ہے:

www.urduchannel.in

''ایک بادشاہ کسی ملک میں حکومت کرتا تھا، وہ بڑا جابر اور سخت گیر تھا۔ایک دفعہ ایک غریب آدمی سے وہ بادشاہ محض اس وجہ سے ناراض ہوگیا کہ اس نے اس بادشاہ کے منہ پر حق بات کہہ دی، جسے اس نے اپنی توہین اور بے عزتی سمجھا اور اپنے تکبر و غرور سے ناراض ہوگیا اور اس غریب کو قید میں ڈلوادیا۔اس وقت اس کے دوست نے اس سے از راہ ہمدردی خیر خواہی کرتے ہوئے کہا: 'تمھیں بادشاہ کے سامنے وہ بات نہ کہنی چاہیے تھی!' اس پر اس شخص نے کہا: 'امر حق کی تبلیغ واجب ہے! اس لیے حق گوئی میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے، خواہ اس کے صلے میں جیل ہی کیوں نہ جانا پڑے۔تکلیف تو آنی جانی شے ہے، مگر حق کو چھپانے کی شے ابدی اور دائمی ہوتی ہے جو کوئی برداشت نہیں کرسکتا۔جب یہ دونوں سرگوشیاں کررہے تھے، اس وقت ایک چغل خور بھی وہیں چھپا سن رہا تھا، اس نے ساری بات بادشاہ تک پہنچادی کہ قیدی اس طرح کی باتیں کررہا تھا۔اس کا گمان ہے کہ کچھ دن بعد اس کی رہائی ہوجائے گی۔بادشاہ نے کہا: 'نہیں! رہائی تو بہت دور کی بات ہے، اس کی موت بھی جیل میں آئے گی!

اس چغل خور نے یہ بات اس قیدی تک پہنچادی۔یہ سن کر اس نے کہا کہ: 'اپنے بادشاہ سے کہنا کہ یہ دنیا تو چند روز کی اس کی خوشی اور غم کا اعتبار نہیں ہے اگر تو مجھے رہا نہ بھی کرے تب بھی میں خوش ہوں اور اگر قتل بھی کرادے تب بھی کوئی غم نہ ہوگا۔تجھے اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے اور فوج بھی دی ہے اور تجھے بادشاہ بنایا ہے، جب کہ میں بال بچوں سے محروم اور غم زدہ ہوں لیکن یہ فرق صرف زندگی تک محدود ہے، کیوں کہ جب ہمیں موت آئے گی اور قبر میں جائیں گے تو میں اور آپ برابر ہوجائیں گے، اس لیے کہ مادی لحاظ سے نہ تیرے پاس کچھ ہوگا اور نہ میرے پاس۔اس لیے مادی دولت پر ناز نہ کر، وہ تو تیرے پاس صرف چند دن کے لیے ہے اور وہ بھی قوم کی امانت ہے مگر تو اسے اس طرح جہنم کا ایندھن نہ بنا۔تجھ سے پہلے بھی کئی مال دار اور بادشاہ گزرے ہیں مگر اب دنیا میں ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے۔اگر اس دولت سے خلق خدا کی خدمت کروگے تو لوگوں کی دعائیں تیری عاقبت سنوار دیں گی ورنہ قبر تنگ ہوجائے گی اور اس پر لوگ لعنت بھیجیں گے اور تو ملعون کہلائے گا۔'

چشم کشا اور طول طویل یہ حکایت جہاں عبرت وسبق سے پُر ہے۔ وہیں اس کی لفظیات وشعریات دلکش اور چشم کشا ہیں۔ ذہن کے بند دریچے کھولتی ہوئے اس کی حکیمانہ باتوں کا سحر جدا ہے۔ اسلوب کی تازگی اور لطافت کا بیان الگ۔ اتنی ساری خوبیوں سے لیس یہ حکایت 'حکایات سعدی' کی سرتاج کہلانے کے قابل حکایت ہے۔ آسان طرز تخاطب، ازل سے ہی خیر وشر، ادنی واعلا کی تفریق اور بادشاہ وفقیر کا معرکۂ ابدی کا قصہ بیان کرنے والی یہ حکایت ادبی شان رکھتی ہے۔ اس کی جزیات نگاری کا اپنا الگ ہی مزہ ہے۔

مذکورہ بالا تمام حکایتیں ادب کی شان اور قد بلند کرنے والی ہیں۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی انھیں اردو ادب کا شاہ کار کہا جاتا ہے اور ان کی گویائی کی محفلیں جمتی ہیں۔ باشعور بچے یا تو خود انھیں پڑھتے ہیں یا اپنے بزرگوں سے ان کا سبق لیتے ہیں۔ ہر علم دوست کے گھر میں ان کی کاپیاں مل جائیں گی جنھیں وہ اپنے بچوں کو موروثی سامان کی طرح چھوڑتے ہیں۔

مآخذو مراجع

حکایتوں کا انتخاب: حکایات سعدی (اردو ترجمہ) خالد چودھری۔ دہلی۔ کتابی دنیا۔2005

گلستان سعدی۔ شیخ سعدی شیرازی۔ تربت جام ڈاٹ کام۔ ایران۔1970

بوستان سعدی۔ شیخ سعدی شیرازی۔ تربت جام ڈاٹ کام۔ ایران۔1970

کریمہ سعدی۔ شیخ سعدی شیرازی۔ جے ایس سنت سنگھ اینڈ سنز۔ لاہور۔ چوک متین۔1932

صدیقی۔ رئیس۔ شیرازی کی کہانیاں۔ نئی دہلی۔ رازی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، 2015

چار کہانیاں۔ (مرتبہ) سیدہ شگفتہ۔ اردو ویب ڈیجیٹل لائبریری۔2012

ایاز احمد۔ شیخ سعدی کی تعلیمات اور عصر حاضر۔ (مقالہ) عالمی رابطہ ادب اسلامی۔ شاخ کرناٹک۔2012

www.urduchannel.in

کرنل (ر) غلام جیلانی خان۔ شیخ سعدی اور گوہر نایاب (مضمون: مشمولہ روزنامہ پاکستان: لاہور ایڈیشن) 26 جون 2014

اسپیشل فیچر: حکایات سعدی۔ روزنامہ 'دنیا' پاکستان۔ کراچی ایڈیشن۔ 26 مئی۔2016

بشیر احمد نحوی۔ پروفیسر۔ حکایات سعدی اور اخلاقیات (مضمون: مشمولہ روزنامہ کشمیر عظمیٰ: جموں ایڈیشن) 4 جولائی۔2012 ش

✹ ✹ ✹